اسرائیل میں چند روز

کے اشرف

جملہ حقوق بحق خواجہ اشرف محفوظ ہیں
ISBN 978-1-4507-8819-9

کتاب : سفر نامہ

مصنف : کے اشرف

سرورق : چارلس کینز

سال اشاعت : 2011

تعداد اشاعت : 1000

مطبع : سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت : 10 ڈاکر

سی ڈبلیو پرنٹرز، 1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا۔ یو ایس اے

انتساب

اپنے وطن میں بے وطن فلسطینیوں کے نام

پیش لفظ

اسرائیلیوں کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل اُن کا آبائی وطن ہے۔ اگر اسرائیل اسرئیلیوں کا آبائی وطن ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر فلسطینی وہاں پر کیا کر رہے ہیں؟ اور اگر فلسطین یہودیوں کے دعویٰ کے برعکس فلسطینیوں کا وطن ہے تو پھر یہودی وہاں پر کیا کر رہے ہیں؟

اگر گزشتہ صدی یا سو اصدی میں دنیا بھر سے یہودیوں کی جوق در جوق فلسطین آمد کا جائزہ لیا جائے تو اِس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی فلسطین میں باہر سے آئے ہیں اور فلسطینی یہاں ہزار ہا سال سے رہ رہے ہیں۔ لیکن اس سفر نامے کا یہ مقصد نہیں کہ فسطین کے بارے میں یہودیوں یا فلسطینیوں کے دعوؤں کی تصدیق یا تردید کی جائے

ایسا کرنا شاید ممکن بھی نہ ہو۔ کیونکہ زمینی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ حقیقت کہیں دونوں کے دعوؤں کے درمیان گم ہے۔ لیکن اسرائیل میں گھومنے پھرنے سے ایک غیر جانبدار انسان آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ اسرائیل میں آباد موجودہ یہودی اِس سر زمیں کے بیٹے نہیں بلکہ باہر سے آئے لوگ ہیں جنہیں مصنوعی طریقوں سے اِس سر زمین کا بیٹا بنایا گیا یا بنایا جا رہا ہے۔

فلسطین میں فلسطینیوں کا حال دیکھیں، ان کی آبادیوں کے گرداگرد بنائی گئی دیواروں اور چیک پوسٹوں پر نظر ڈالیں تو احساس ہوتا کہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے جو مسلسل اِس سر زمین پر جنم لے رہا ہے اور اِس المیے کا کوئی خوش گوار انجام مستقبل قریب یا بعید میں زونما ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

میں نے کھلے دل اور دماغ کے ساتھ اسرائیل کا سفر کیا۔ اسرائیل میں چند فلسطینیوں سے اسرائیل کا سفر نامہ لکھنے کا ذکر ہوا تو اُنہوں نے استفسار کیا کہ سفر نامہ کس زبان میں لکھا جا رہا ہے۔ میں نے جواب دیا اُردو میں۔ کہنے لگے اِس سفر نامہ کو کیا ٹائیٹل دینے جا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا "اسرائیل میں چند روز۔" فرمانے لگے اسرائیل کی بجائے اِس کا ٹائیٹل رکھو "فلسطین میں چند روز۔" میں نے جواب دیا میں

اِس ملک میں سفر اسرائیل کی حکومت کی اجازت سے کر رہا ہوں۔ میرے پاسپورٹ پر اسرائیل کی مہر لگی ہے۔ اِس لئے فلسطینیوں سے مکمل ہمدردی رکھنے کے باوجود میں اسے "اسرائیل میں چند روز" ہی کہوں گا۔ اگر میری زندگی میں اسرائیل کی جگہ فلسطین کی حکومت قائم ہو گئی اور میرے پاسپورٹ پر فلسطین کی مہر لگی تو ایک اور سفر نامہ لکھوں گا اور اُس کا عنوان رکھوں گا "فلسطین میں چند روز۔" میرے جواب سے میرے فلسطینی بھائی آزردہ ہوئے جس سے مجھے بھی دکھ ہوا لیکن اِس وقت جو ہے اور جیسا ہے اُس سے کیسے انکار کیا جائے۔؟

اسرائیل میں گھومنے پھرنے اور بڑے پیمانے پر لوگوں سے ملنے کے بعد میں حکومتِ اسرائیل کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ اِس خطے کے تاریخی پسِ منظر میں اگر اسرائیل فلسطینیوں سے برابری کی سطح پر معاملات طے کرے تو یہ فلسطینیوں، اسرائیل، اس خطے کے لئے اور بین الاقوامی امن کے لئے بہت بہتر ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں اگر اسرائیل نے اپنی موجودہ پالیسیاں جاری رکھیں اور فلسطینیوں کے ساتھ اُس کے معاملات اِسی طرح چلتے رہے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ اِس خطے میں کبھی امن قائم نہیں ہو گا اور اسرائیل کی کامیابیاں بھی دیرپا ثابت نہیں ہوں گی۔ کیونکہ اسرائیل کی موجودہ پالیسیاں اسِ خطے کی تاریخ سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

اسرائیل بحرِ روم کا وہ علاقہ ہے جو انسانی تاریخ میں حملہ آوروں کا سب سے زیادہ نشانہ بنتا رہا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی اور علاقہ ہو گا جہاں اتنے حملہ آور آئے ہوں جتنے یروشلم میں آئے۔ دنیا بھر کی انسانی تاریخ میں شاید ہی کسی شہر کا اتنی بار محاصرہ کیا گیا ہو جتنی بار یروشلم کا کیا گیا ہے۔ کیا اِس تاریخی صورتِ حال کو ہمیشہ کے لئے بدل دینا اسرائیل کے لئے ممکن ہے؟ میں سمجھتا ہوں ایسا صرف پُر امن ذرائع سے ممکن ہے۔ جنگی ذرائع سے اِسے یقیناً ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔

شاید یہ بات اُن لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے جو امن کو دو جنگوں کا درمیانی وقفہ سمجھنے کے فلسفے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ زندگی کی نشوونما اور افزائش میں امن کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ میری اِس بات سے اتفاق کریں گے کہ فلسطینیوں کے ساتھ امن قائم کرنا کس طرح اسرائیل کے اپنے مفاد میں ہے۔

آخر میں میں اپنے قارئین سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سفر نامہ پڑھنے کے بعد وہ مجھے اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کریں۔ اِس سے مجھے اِس سفر نامے کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور میں اپنی مستقبل کی تحریروں کو اُن کی آراء کی روشنی میں بہتر بنا سکوں گا۔ ایک لکھاری کے لئے اِس سے بڑی بات کوئی نہیں ہوتی کہ اُس کے قاری اُس کی تحریروں کے بارے میں اُس کو اپنی آراء سے آگاہ کریں۔ مجھے آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

کے اشرف
1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا، 94702
یو ایس اے
Email: kashraf@ix.netcom.com

اسرائیل کا موجودہ نقشہ

اسرائیل میں چند روز

میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی اسرائیل بھی جاؤں گا۔ یورپ میں اپنی کتابوں کی تقاریب رونمائی کے سلسلے میں مختلف شہروں میں ایک ماہ گزارنے کے بعد واپس سان فرانسسکو لوٹا تو چند دن بعد طبعیت پھر سفر کے لئے مچلنے لگی۔ تھوڑے دن اس غوروخوض میں گزرے کہ اب کہاں جایا جائے؟ اس سلسلے میں مختلف دوستوں سے بات ہوئی تاکہ اُن کے سفری تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آئندہ ٹرپ کا منصوبہ بنایا جائے۔

جان فرگوسن اور اُس کی بیوی کیٹ حال ہی میں اسرائیل یاترا سے لوٹے تھے۔ جان عقیدے کے اعتبار سے عیسائی جب کہ اُس کی بیوی یہودی ہے۔

جب جان سے اُس کی زبانی اُس کی اور اُس کی بیوی کی اسرائیل یاترا کی داستان سُنی تو فوراً خیال آیا کہ کیوں نہ اسرائیل ہی جایا جائے۔ اگر اسرائیل یہودیوں اور عیسائیوں کے تاریخی واقعات پر مبنی داستانوں کا مرکزی اسٹیج رہا ہے تو اُس سے مسلمانوں کی بے شمار تاریخی یادیں بھی جُڑی ہوئی ہیں۔ آخر مسلمانوں کی کہانی بھی تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے یہودیوں اور عیسائیوں کی۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم صرف یہودیوں یا عیسائیوں کے نہیں مسلمانوں کے بھی تو جدِ امجد تھے۔

اِس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً اسرائیل جانے کا فیصلہ کیا اور اِس سفر کی تیاری شروع کر دی۔ کئی ائیر لائینوں سے انکوائری کے بعد سب سے اچھی ڈیل ائیر کینیڈا کی طرف سے ملی۔ چنانچہ فوری طور پر ائیر کینیڈا سے سان فرانسسکو سے تل ابیب تک کا دو طرفہ ٹکٹ خرید لیا۔ یہ ٹکٹ تو ائیر کینیڈا نے جاری کیا تھا لیکن ٹکٹ جرمن ائیر لائن لفتھانسا کا تھا۔ یوں تو اپنی ساری عمر دنیا بھر میں سفر کرتے گزری ہے لیکن لفتھانسا ائیر لائن پر ابھی تک سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کئی برس پہلے جرمنی گیا تھا لیکن اُس وقت بھی سفر جرمن ائیر لائن لفتھانسا کی بجائے ائیر فرانس پر کیا تھا۔

ایئر لائن پر اسرائیل کی ٹکٹ بک کرانے کے بعد میں نے انٹرنیٹ پر ہوٹلوں کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے اسرائیل کے سفر کا ارادہ کرتے ہی ذہن بنالیا تھا کہ تل ابیب میں قیام کرنے کی بجائے یروشلم میں کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ کیونکہ ایک تو زیادہ تر تاریخی واقعات کا مرکزی اسٹیج ہمیشہ یروشلم رہا ہے اور دوسرے یہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کا ایسا نقطہ اتصال ہے جہاں تینوں ایک ساتھ نہ رہنے کی خواہش رکھنے کے باوجود تاریخی جبر کے تحت ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔

تاریخ کے انسانوں پر جبر کا مشاہدہ کرنا ہو تو اِس کے لئے یروشلم سے بہتر کوئی شہر نہیں ہے۔ بہت سے ممالک جہاں مذہبی تقسیم کی وجہ سے آئے روز قتل و غارت ہوتی رہتی ہے وہ یروشلم سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں- یہ نہیں کہ تل ابیب میں یہ جبر موجود نہیں۔ وہاں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ لیکن تل ابیب میں اسرائیلیوں کی موجودگی کو لگتا ہے عرب مسلمانوں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔ لیکن یروشلم، حیبران، نابلس، جریکو اور رام اللہ میں صورت حال مکمل طور پر مختلف ہے۔ ویسٹ بینک اور غزہ میں تو باقاعدہ فلسطینی ایک الگ ریاست کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

انٹرنیٹ پر خاصی جدوجہد کے بعد آخر میں نے ایک ہوٹل تلاش کیا جس کا کرایہ یروشلم اور تل ابیب کے دیگر ہوٹلوں کی نسبت بہت کم تھا۔ انٹرنیٹ پر ہوٹل اور کمروں کی تصاویر دیکھیں تو مناسب محسوس ہوئیں۔ لیکن پھر بھی تسلّی کے لئے میں نے ہوٹل انتظامیہ کو کال کی۔ پتہ چلا کرایہ کم ہونے کی وجہ ہوٹل کا محلِ وقوع تھا۔ ہوٹل پُرانے یروشلم میں مسجدِ اقصیٰ سے چند بلاک کے فاصلے پر واقع ہے جو کہ کلی طور پر مسلمانوں کا علاقہ ہے اور یہودی وہاں جانے سے گھبراتے ہیں۔

بہر حال میرے لئے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ میں تو وہاں ایک سیاح کی حیثیت سے جا رہا تھا۔ میرے لئے یہ اہم نہیں تھا کہ ہوٹل جس علاقہ میں واقع ہے وہاں یہودی زیادہ رہتے ہیں یا مسلمان۔ ایک لحاظ سے میرے لئے یہ بہتر تھا کیونکہ مسلم تاریخ کا حصہ ہونے کی وجہ سے مجھے مسلم تاریخ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لئے ہوٹل کا محلِ وقوع میرے نقطہ نظر سے بہتر تھا۔

ہوٹل کے بارے میں اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے ہوٹل انتظامیہ سے درخواست کی کہ بن گورین انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر اترنے کے بعد مجھے ہوٹل تک پہنچے کے لئے گاڑی کی ضرورت ہو گی۔ ہوٹل مینیجر نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ ہوٹل کا ڈرائیور ائیر پورٹ پر میرا منتظر رہے گا۔

اِس انتظام کے بعد میری اسرائیل کی سیاحت کا بندوبست مکمل تھا۔ 17 جولائی، بروز اتوار، سان فرانسسکو سے صبح سات بجے میری روانگی تھی۔ لیکن روانگی سے تین دن پہلے سر شام دائیں آنکھ میں خون کی ایک رگ پھٹ جانے کی وجہ سے بینائی تقریباً مسدود ہو گئی۔ اب اسرائیل رخصتی سے پہلے اپنے آنکھوں کے ڈاکٹر سے ملنا ضروری تھا۔ صبح جمعہ تھا اور ویک اینڈ پر میرا ڈاکٹر چھٹی پر ہوتا ہے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میں اتنے شارٹ نوٹس پر اُس سے ملاقات کا وقت حاصل کر سکوں گا یا نہیں۔

اگلی صبح ڈاکٹر کی نرس کو فون کیا تو اُس نے مجھے اُسی شام کا وقت دے دیا۔ شام کے وقت ڈاکٹر سے ملا تو اِس بار اُس نے لیزر سرجری کرنے کی بجائے آنکھ میں انجکشن لگایا اور کہنے لگا ایک ماہ میں آنکھ میں پھیلا خون صاف ہو جائے گا اور بینائی بحال ہو جائے گی۔

ایک آنکھ کی بینائی بند ہو جانے کی وجہ سے میں اپنے اسرائیل کے ٹرپ کے بارے میں کچھ گو مگو کا شکار ہو گیا۔ کبھی سوچتا ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ رفتہ رفتہ ایک ماہ میں آنکھ صاف ہو جائے گی۔ اِس لئے اب سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر خیال آتا اگر سفر میں دوسری آنکھ بھی خراب ہو گئی تو پھر کیا کروں گا۔

اسرائیل جانے کے بارے میں دو دلی کی یہ کیفیت اتوار کی صبح گھر سے نکلنے تک قائم رہی۔ آخر میں نے گو مگو کی اس کیفیت کو خیر باد کہا اور اپنا سفری بیگ اُٹھا کر ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں زندگی میں اِتنے بین الاقوامی سفر کر چکا تھا جس سے مجھے مکمل یقین تھا کہ اگر کوئی اِس طرح کی صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں کسی نہ کسی طرح اُس سے عہدہ بر آ ہو سکوں گا۔

ائیر پورٹ پہنچ کر ائیر لائن کے کاؤنٹر سے بورڈنگ پاس لیا اور سکیورٹی سے گزر کر گیٹ پر پہنچا تو جہاز پر بورڈنگ پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں سیدھا جا کر جہاز میں بیٹھ گیا۔ جہاز میں بیٹھنے کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ابھی تک تذبذب کی تھوڑی سی کھلی کھڑکی بالکل بند کر دی اور پیشِ نظر اسرائیل کے اپنے پہلے ٹرپ کے بارے میں سوچنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اپنے ذہن میں منصوبہ بندی شروع کر دی کہ اسرئیل میں مجھے اپنے قیام کے دوران اگلے چھ دن کہاں کہاں جانا ہے۔ کیا کیا دیکھنا ہے۔

تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے جہاز کی روانگی کا اعلان کیا۔ جہاز کا دروازہ بند ہوا اور اُس نے اُڑان بھرنے کے لئے رن وے پر حرکت شروع کر دی۔ چند منٹوں بعد رن وے پر دوڑنے کے بعد جہاز فضا میں بلند ہوا تو میں نے اپنے سفر اسرائیل کی جزئیات سوچتے ہوئے سر نشست کی پشت کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کبھی ہوا کے دباؤ میں کمی کی وجہ سے جہاز چند لمحوں کے لئے تھرتھراتا تو آنکھ کھل جاتی لیکن میں جلد ہی اِس تھرتھراہٹ کو فراموش کر کے دوبارہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا۔ میں نے ائیر ہوسٹس سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں سو جاؤں تو مجھے لنچ یا ڈنر کے لئے نہ اُٹھایا جائے۔ چنانچہ ائر ہوسٹس کی عدم مداخلت کی وجہ سے میری خوابیدگی اُس وقت ختم ہوئی جب جہاز نے جرمنی کے شہر میونخ کے ائیر پرٹ پر لینڈ کیا۔

میں نے کھڑکی سے دیکھا باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا بوندا باندی کی وجہ سے میونخ میں دن خاصہ خوشگوار تھا۔ لیکن مجھے ائیر پورٹ سے باہر نہیں جانا تھا۔ صرف سان فرانسسکو سے آنے والے جہاز سے اُتر کر تل ابیب جانے والے جہاز میں سوار ہونا تھا۔ دونوں جہازوں کی آمد و رفت میں تقریباً دو گھنٹے کا فرق تھا جو کہ میونخ جیسے بڑے ائیر پورٹ کے ایک کونے پر کھڑے سان فرانسسکو سے آنے والے جہاز سے اتر کر تل ابیب جانے والے دوسرے کونے پر کھڑے جہاز تک جانے اور اسرائیلی سکیورٹی سے گزرنے کے لئے یقیناً کچھ زیادہ نہیں تھا۔

2

جو لوگ بین الاقوامی سفر کے عادی ہیں وہ جانتے ہیں کہ 11/9 کے بعد ائیر پورٹوں پر سکیورٹی معاملات پر کس قدر وقت صرف ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ کچھ حالات سنبھل جاتے ۔ عام مسافروں کی زندگی کچھ آسان ہو جاتی۔ لیکن ایک مکمل دہائی گزرنے کے باوجود بین الاقوامی سفر کے راستے میں دشواریاں نہ صرف جوں کی توں قائم ہیں بلکہ جیسے جیسے وقت گزرا ہے اِن میں اضافہ ہوا ہے اور مسلسل ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ایک کے بعد سکیورٹی سے متعلقہ دوسری مشین ایجاد ہو جاتی ہے جس سے اِس طرح کی مشینیں بنانے والی کمپنیاں تو اربوں ڈالر کما رہی ہیں لیکن مسافروں کے ذاتی حقوق کی فہرست کچھ مزید سکڑ جاتی ہے۔ اب تو سکیورٹی کی ایسی ایسی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں جن سے مردوں اور عورتوں کی پرائیویسی ختم ہو گئی ہے۔

بین الاقوامی مسافر ہونے کی وجہ سے میں نے کئی ممالک کے سکیورٹی انتظامات کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے لیکن جس طرح کی سکیورٹی چیکنگ کا تجربہ مجھے میونخ ائیر پورٹ پر اسرائیل کے لئے روانہ ہونے والی فلائیٹ پر ہوا اِس سے پہلے ایک دہائی میں کبھی کسی ائیر پورٹ پر نہیں ہوا تھا۔

ہوا یوں کہ جیسے ہی میں سان فرانسسکو سے آنے والے ہوائی جہاز سے اُترا میں نے ائیر پورٹ کے اندر پروازوں کی آمدورفت والے برقی بورڈ پر نظر ڈالی۔ اِس بورڈ سے اسرائیل کی فلائیٹ کی انفارمیشن غائب تھی۔ حالانکہ سان فرانسسکو میں ائیر لائن کے چیک اِن کاؤنٹر کلرک نے مجھے دونوں بورڈنگ پاس جاری کر دئے تھے۔ لیکن میونخ سے تل ابیب جانے والی فلائٹ کے بورڈنگ پاس پر گیٹ نمبر درج نہیں تھا۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے سان فرانسسکو ہی میں بتا دیا تھا کہ اِس فلائیٹ کا گیٹ نمبر میونخ ائیر پورٹ پر فلائٹ کی روانگی سے پہلے پتہ چلے گا۔

جہاز سے اُترتے ہی میں نے برقی انفارمیشن بورڈ پر تل ابیب کی فلائیٹ کا گیٹ نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اُس پر انفارمیشن موجود نہیں تھی۔ میں نے ہال وے میں کھڑی لفتھانسا ائیر لائن کی ایک کلرک سے فلائیٹ کے گیٹ کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا یہ انفارمیشن مجھے صرف فلائیٹ انفارمیشن سنٹر سے ملے گی۔ میں بیگ اُٹھائے فلائیٹ انفارمیشن سنٹر پہنچا تو کلرک نے بورڈنگ پاس لے کر اُس پر گیٹ نمبر لکھ دیا۔

فلائیٹ کا گیٹ ٹرمینل کے دوسرے سرے پر تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا گیٹ پر پہنچا تو پتہ چلا کہ فلائیٹ پر سوار ہونے والے سب لوگوں کی دوبارہ سکیورٹی چیکنگ ہو رہی ہے۔ اس چیکنگ کے عمل میں کسی بچے بوڑھے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ سب کو سر تا پا انتہائی احتیاط سے چیک کیا جا رہا تھا۔ ایک ایک چیز دیکھی جا رہی تھی۔ سب کے جوتے، بٹوے، عینکیں، کمپیوٹر، ہینڈ بیگ اور جس کے پاس جو تھا بہت توجہ کے ساتھ چیک کیا جا رہا تھا۔

ہر مسافر کو ایک کے بعد دوسری ٹانگ اٹھانے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ اگر کوئی کسی معذوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا تو اسے پاس ہی پڑی مشین کا سہارا لے کر ٹانگ اٹھانے کی تاکید کی جاتی۔ پھر اُن کے پیروں کے تلوؤں کا بغور جائزہ لیا جاتا۔ تلوؤں پر میٹل تلاش کرنے والی مشین پھیری جاتی۔ اگر آواز آتی تو جرابیں اتروائی جاتیں۔ بیلٹ کھلوا کر پینٹوں کو اندر سے چیک کیا جاتا۔ یہ سب کچھ باڈی اسکین کرنے والی مشین سے گزرنے کے باوجود ہر مسافر کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

میں سکیورٹی کے عمل سے گزرنے کے بعد سکیورٹی کے عین سامنے بچھی گیٹ کی سیٹوں پر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے سکیورٹی میں سے گزرنے والوں کے چہروں کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔ جہاز پر سوار ہونے والے زیادہ تر اسرائیلی یا یورپی یہودی دکھائی دیتے تھے۔ مجھے سکیورٹی کے عمل سے گزرتے کسی بچے، بوڑھے، مرد یا عورت کے چہرے پر ناپسندیدگی یا ناگواریت کے تاثرات دکھائی نہ دیئے۔ سب کے چہروں پر ایک اطمینان تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اُنہیں احساس ہے کہ اُن کا وطن اسرائیل ایک خطرناک

صورتِ حال سے دوچار ہے اِس لئے اُن کے ساتھ بھلے جو سلوک ہو سو ہو لیکن وہ اسرائیل کی خاطر کچھ بھی برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

فلائٹ کی روانگی کے وقت سے آدھا گھنٹہ اُوپر ہو چکا تھا۔ لیکن سب خاموش بیٹھے تھے کسی طرف کوئی اضطراب نہیں تھا۔ ابھی سکیورٹی کا عمل جاری تھا کہ جہاز پر مسافروں کو بٹھانے کا کام شروع ہو گیا۔ دو مختلف دروازوں سے مسافروں کو خاصی تیزی کے ساتھ جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔

تقریباً سب مسافر جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ جہاز کا ایک دروازہ بند کر دیا گیا۔ لیکن دوسرا دروازہ ابھی تک کُھلا تھا۔ پائلٹ نے عبرانی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر عبرانی بولنے کے بعد اُس نے وہی بات انگریزی میں دہرائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ سب کو اسرائیل جانے فالی فلائٹ پر خوش آمدید کہتا ہے۔ وہ معذرت چاہتا ہے کہ سکیورٹی چیکنگ کی وجہ سے جہاز پہلے ہی پنتالیس منٹ لیٹ ہو چکا ہے۔ ابھی بھی سکیورٹی میں کوئی پندرہ مسافر باقی ہیں۔ جن کی وجہ سے جہاز کی روانگی میں مزید تاخیر ہو سکتی ہے۔"

پائلٹ کے اعلان کے بعد بھی سبھی مسافر اطمینان سے بیٹھے رہے۔ کسی نے کسی کے کان میں کوئی بات نہ کی۔ نہ کسی نے کسی قسم کے کوئی طنزیہ ریمارکس پاس کئے۔

آخر خدا خدا کر کے سکیورٹی چیکنگ کا تھکا دینے والا سلسلہ ختم ہوا تو پائلٹ نے جہاز کی روانگی کی نوید سنائی۔ ابتدائی حرکت سے لے کر چند منٹ رن وے پر دوڑنے کے بعد لفتھانسا ائیر لائن کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو جہاز میں مسافروں کی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ اسمارٹ ائیر ہوسٹسیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد مسافروں کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ پیش کرتی رہیں۔

میونخ سے پرواز کرنے اور فضا میں تین گھنٹے مسلسل اڑنے کے بعد طیارہ اسرائیل کی فضائی حدود میں داخل ہوا تو پائلٹ نے پھر عبرانی زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ وہ کافی دیر تک عبرانی میں مسافروں کو اسرائیل کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے جہاز کی کھڑکی کھول کر اسرائیل کا فضائی جائزہ لینا شروع کر دیا

۔ اچانک نہ جانے کیوں اسرائیل کے بارے میں نوائے وقت کے ایڈیٹوریل میں بارہا چھپنے والا ایک جملہ میرے ذہن میں کلبلانے لگا۔

نوائے وقت جب کبھی اسرائیل اور عربوں کی باہمی چپقلش کے بارے کچھ لکھتا ہے تو اسرائیل کو کھجور کی گٹھلی کے برابر ریاست کہہ کر اُس کا ذکر کرتا ہے۔

پائلٹ عبرانی میں جہاز کے مسافروں سے مخاطب تھا اور میں بقول نوائے وقت کھجور کی گٹھلی کے برابر اِس ریاست کا فضائی جائزہ لے رہا تھا۔

جہاز ابھی تک تل ابیب کی فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ فضائی جائزے سے میرے ذہن میں تل ابیب کی تصویر تیسری دنیا کے دیگر شہروں جیسی بن رہی تھی۔

میں کئی بار دبئی، قطر، دوہا اور مکہ کا فضا سے جائزہ لے چکا تھا۔ وہ فضائی جائزے میں مجھے تل ابیب سے بہتر شہر دکھائی دئے تھے۔ تل ابیب یافا کے پرانے شہر کے پہلو میں خالصتاً اسرائیلی یہودی آباد کاروں نے آباد کیا تھا اِس لئے اِس شہر کو دبئی، دوحا، قطر اور مکے سے بہتر منظر پیش کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اسرائیل کا لینڈ اسکیپ بہر حال مشرق وسطیٰ جیسا تھا۔ اِس لئے اِس حقیقت کے تناظر میں میں نے فی الحال تل ابیب کی تصویر مشرق وسطی کے ایک عام شہر کی سی بنالی۔

جہاز نے بن گورین انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر لینڈ کیا تو پائلٹ نے اپنا پیغام عبرانی سے انگریزی میں منتقل کر دیا۔ وہ مسافروں سے کہہ رہا تھا بن گورین ائیرپورٹ پر تصویر کشی کی اجازت نہیں ہے۔ اِس لئے کوئی مسافر اس ائیرپورٹ پر کسی قسم کی تصویر کشی کی کوشش نہ کرے۔

3

جہاز کا دروازہ کُھلا تو گرم ہوا کے تھپیڑے نے مجھے اسرائیل میں خوش آمدید کہا۔ لیکن جلد ہی ہال وے میں ائیر کنڈیشنر کی ہوا نے اُس تھپیڑے کا اثر زائل کر دیا۔

جہاز کے دروازے سے امیگریشن کاؤنٹر تک خاصہ فاصلہ تھا۔ راستے میں سارے ہال وے میں انتہائی دانشمندی سے اسرائیلی پس منظر سے ایسے تصویری امیجز بنائے گئے ہیں جن سے یہودیوں کی علم و ادب اور سائنس و ٹکنالوجی میں خدمات سے انسان کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بات صرف یہاں تک محدود نہیں رہتی۔ امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچنے سے پہلے ان تصویری پیغاموں کے ذریعے مسافروں کے شعور میں بہت سی ایسی انفارمیشن داخل کر دی جاتی ہے جس سے اُنہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسرائیل کوئی معمولی ملک نہیں ہے۔ اگر وہ غیر متعصب ہوں تو وہ دل کی گہرائیوں سے اسرائیل کی کامیابیوں کو سراہنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ تصویری پیغامات صرف عام مسافروں کے لئے نہیں۔ یہ دنیا بھر سے اسرائیل آنے والے یہودیوں کے لئے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اِن میں سے ہر تصویری پیغام اسرائیل آنے والے ہر یہودی کو کہتا ہے کہ تم اسرائیل کا حصہ ہو اور اسرائیل تمہارا حصہ ہے۔ ایک پیغام میں تو واقعتاً یہ کہا گیا ہے کہ تم ہمارا حصہ ہو اور ہم تمہارا حصہ ہیں۔

یہ سارے تصویری خاکے دیکھتے اور پیغام پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا اگر یہ سب کچھ میرے لئے اِس قدر متاثر کن ہے تو دنیا بھر سے آنے والے یہودیوں پر اِس کا کیا اثر ہوتا ہو گا؟ اِن تصویری خاکوں کو دیکھ کر یقیناً فرطِ جذبات سے اُن کی آنکھیں نم ہو جاتی ہوں گی۔ شدتِ جذبات سے وہ سسک کر بے اختیار پکار اٹھتے ہوں گے "اسرائیل تو عظیم ہے۔ تیرے بیٹے بیٹیاں دنیا بھر سے تیری محبت کے نغمے گاتے تیرے حضور عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے چلے آتے ہیں۔ اسرائیل۔ اسرائیل۔ اسرائیل۔"

اِنہی خیالات میں گُم میں اپنا بیگ کندھے پر لٹکائے رفتہ رفتہ پاسپورٹ کنٹرول کے سائن کو فالو کرتا امیگریشن ڈیسک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دائیں ہاتھ تقریباً تیس فٹ اونچی زرد رنگ کی دیوار پر نظر پڑی۔ دیوار کو دیکھ کر تاثر ابھرتا تھا کہ پتھروں سے بنائی گئی ہے۔

مجھے دیوار کے اوپر مخالف سمت میں مسافر چلتے دکھائی دیئے۔ شاید وہ سب لوگ اسرائیل یاترا سے واپس جارہے تھے۔ اُن کی چال ڈھال اور رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسرائیل سے مطمئن اپنے عارضی طور پر اپنائے وطنوں کو واپس لوٹ رہے ہیں۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ دنیا بھر میں پھیلے ہیں لیکن اُن کے دل، دماغ اور روحیں ہمیشہ اسرائیل میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اسرائیل کی خدمت میں کمر بستہ رہتے ہیں۔

طویل راستہ طے ہوا تو سب مسافر اُس ہال میں داخل ہوئے جہاں امیگریشن کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ سارے مسافر کاؤنٹروں کے سامنے قطاروں میں کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ ساتھ ساتھ امیگریشن حکام نے آنے والوں کے پاسپورٹوں پر داخلے کی مُہریں ثبت کرنا شروع کر دیں۔ ہال میں زیادہ مسافر ہونے کی وجہ سے امیگریشن کے حکام پر کام کا دباؤ بڑھا تو اُنہوں نے فوراً پندرہ کاؤنٹر اور کھول دیے۔ اِس طرح اُن کے کام کی رفتار تیز ہو گئی اور مسافروں کی لائنوں میں تیزی سے حرکت ہونے لگی۔

جس لائن میں میں کھڑا تھا اُسے ایک نوجوان اسرائیلی لڑکی ہینڈل کر رہی تھی۔ وہ باقی امیگریشن حکام کے برعکس ہر مسافر کے ساتھ زیادہ سوال و جواب کر رہی تھی۔ لگتا تھا طویل سوال و جواب سے مسافروں کو زک پہنچا کر وہ حظ حاصل کر رہی ہے۔ کئی بار میں نے سوچا لائن تبدیل کر لوں لیکن پھر آگے پیچھے مسافروں کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے اُسی لائن میں کھڑا رہا۔

آخر کار باری آنے پر جب میں آگے بڑھا تو اُس نے خلافِ معمول میرا پاسپورٹ تھامتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے بھی جواباً خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس کا حال احوال پوچھا۔ میرے پاسپورٹ کے مندرجات پڑھتے ہوئے اُس نے مجھ پر پہلا سوال پھینکا: "تم اسرائیل کیوں آئے ہو؟"

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے پُر سکون لہجے میں جواب دیا" مجھے تاریخ یہاں لائی ہے۔" وہ میرا جواب سن کر ہلکا سا کِھل اُٹھی۔ کہنے لگی "کیا تمہاری فیملی یہاں ہے؟" میں نے جواب دیا" نہیں میرا یہاں کوئی نہیں۔" "تو کیا کوئی دوست ہے؟" اب بھی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ "نہیں یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کہاں ٹھہروگے یہاں پر؟" یروشلم میں پینوراما ہوٹل میں کمرہ بک کروا رکھا ہے۔" جس طرح وہ سوال پر سوال کر رہی تھی لگتا تھا اُسے میرے پاسپورٹ پر مُہر ثبت کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔

پھر کہنے لگی " یروشلم کے علاوہ کہاں کہاں جاؤگے؟" میں نے قدرے پُر سکون لہجے میں جواب دیا "یروشلم میں دیکھنے کے لئے اتنا کچھ ہے کہ سات دن پلک جھپکتے گزر جائیں گے اور کہیں جانے کے لئے وقت نہیں بچے گا۔ کاش ہوتا۔"

میرا جواب سُن کر اُس نے میرے پاسپورٹ پر داخلے کی مُہر ثبت کی اور پاسپورٹ واپس کرتے ہوَئے مسکراتے چہرے کے ساتھ مجھے اسرائیل میں خوش آمدید کہا۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا بیگ دوبارہ کندَھے پر لٹکا کر امیگریشن ہال سے باہر نکل آیا۔ کسٹم میں ڈکلیر کرنے کے لئے میرے پاس کچھ تھا نہیں۔ لیکن وہیں کسٹم ایریا میں مجھے کرنسی تبدیل کرنے کا کاؤنٹر دکھائی دیا۔

میں نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی لڑکی سے پوچھا کہ شیکل کا سب سے بڑا نوٹ کونسا ہے ۔ کہنے لگی دو سو شیکل۔ میں نے اُس سے کرنسی کا ریٹ پوچھا جو مجھے مناسب لگا۔ میں نے یو ایس اے سے روانگی سے پہلے کرنسی کا ریٹ چیک کر لیا تھا۔ میں نے اپنے بٹوے سے سو سو ڈالر کے دس نوٹ نکال کر لڑکی کو دیتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں شیکلز میں تبدیل کر دے۔

اُس سے شیکلز لے کر میں نے بٹوے میں ڈالے اور اپنا بیگ دوبارہ کندھے پر لٹکا کر گرین چینل سے باہر نکل آیا۔ پاس ہی کچھ کسٹم حُکام ایک نوجوان فلسطینی کے سامان کا معائنہ کر رہے تھے۔ کسٹم والوں اور

اُس نوجوان فلسطینی میں تکرار چل رہی تھی۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے تھے اُس میں سے کچھ میرے پلے نہ پڑا۔ کیونکہ دو دونوں عبرانی میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں وہیں ایک دوسرے سے تکرار کرتے چھوڑااور خود کسٹم ہال سے باہر نکل گیا۔

جہاز سے اُترنے سے لے کر امیگریشن اور کسٹم سے گزرنے تک مجھے اسرائیل کے بارے میں سب سے اچھی چیز یہ لگی کہ اسرائیل میں داخلے کے لئے مجھے امیگریشن یا کسٹم کے لئے کوئی فارم نہ بھرنا پڑا۔ ورنہ کسی بھی اور ملک میں کسٹم کا فارم نہ بھی ہو لیکن امیگریشن کا فارم بہر حال بھرنا پڑتا ہے۔

جب جہاز تل ابیب کے ائیر پورٹ پر اُتر رہا تھا میں نے ائیر ہوسٹس سے امیگریشن فارم کے بارے میں پوچھا لیکن اُس نے مجھے بتایا کہ اسرائیل میں داخلے کے لئے ایسا کوئی فارم نہیں بھرنا پڑتا۔ اُس کا جواب سُن کر مجھے محسوس ہوا وہ شاید اِس شعبے میں نئی ہے اور اُسے اِس بارے میں مکمل انفارمیشن حاصل نہیں ہے۔ لیکن اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ اسرائیل میں داخلے کے لئے کوئی فارم نہیں تھا۔ اُس وقت مجھے کئی ممالک کے امیگریشن فارم یاد آئے جنہیں بھرنے کے لئے مسافر کو جہاز میں بھی وکیل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

اسرائیل میں پہلا دن

امیگریشن اور کسٹم حکام سے فارغ ہو کر باہر پیسنجر لاؤنج میں قدم رکھا تو مجھے وہاں پر بہت سے منتظر چہرے دکھائی دئے- لیکن وہ میرا نہیں اپنے عزیزہ اقارب کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کئی ایک نے اپنے ہاتھوں میں مختلف ناموں کے کتبے اٹھا رکھے تھے۔

مجھے بھی کسی ایسے ہی کتبے کی تلاش تھی جس پر میرا نام لکھا ہو۔ پینوراما ہوٹل والوں نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ اُن کا ڈرائیور مجھے وصول کرنے کے لیے ائیر پورٹ پر موجود ہو گا۔ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے وہاں اپنے نام کا کتبہ بردار کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دیا۔

آخر میں نے ہر کتبہ بردار کے پاس جا کر اُن پر لکھا نام بغور پڑھا لیکن سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

مجھے ائیر پورٹ سے باہر آنے میں کوئی غیر معمولی وقت بھی صرف نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے دو بجے میرا جہاز بن گورین انٹر نیشنل ائیر پورٹ پر اُترا تھا۔ میں سوا تین بجے کے قریب پیسنجر لاونج میں اپنے ڈرائیور کا منتظر تھا۔ حالانکہ اصولاً اُسے میرا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

سولہ ستر اگھنٹے کے سفر نے مجھے خاصہ تھکا دیا تھا۔ اُس پر لہو میں ڈوبی داہنی آنکھ مستزاد۔ دائیں آنکھ کی خرابی بائیں آنکھ کی نظر کا توازن بھی خراب کر رہی تھی۔

میرے پاس ہوٹل والوں کا نمبر موجود تھا۔ میرا سیل بھی وہاں پر کام کر رہا تھا۔ لیکن میں نے ہوٹل والوں کو کال کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔

مجھے وہاں ایک ٹیکسی والا دکھائی پڑا۔ میں نے اُس سے پوچھا یروشلم چلوگے۔ اُس نے ایڈریس پوچھا میں نے ہوٹل کا ایڈریس بتا دیا۔ کہنے لگا میں جانتا ہوں یہ ہوٹل کہاں ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ بن گورین انٹر نیشنل ائیر پورٹ سے ٹیکسی ڈرائیور یروشلم جانے کے تین یا چار سو شیکل چارج کرتے ہیں۔ پھر بھی اطمینان کے لئے میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ یروشلم جانے کے کتنے شیکل لے گا۔ اُس نے کہا وہ میٹر

دیکھ کر بتائے گا کہ جہاں میں جارہا ہوں اُس جگہ کا کتنا کرایہ بنتا ہے۔ یہ سن کر کہ یہ لکھا ہوا کرایہ بتائے گا میں اُس کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ اُس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ ٹیکسی یروشلم جانے والی فری وے پر چڑھی تو اُس نے میٹر آن کیا تو میٹر پر ساڑھے چار سو شیکل کی رقم روشن ہو گئی۔

میں نے زندگی میں پہلا ٹیکسی میٹر دیکھا تھا جس نے سفر کے اختتام سے پہلے سارے سفر کا کرایہ بتا دیا تھا۔ کرایہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ کچھ زیادہ رقم بتا رہا ہے۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ فری وے پر اترنا یا اُسے واپس ائیر پورٹ پر جانے کے لئے کہنا پاگل پن تھا۔ چنانچہ میں نے چپ چاپ بیٹھے رہنے میں عافیت سمجھی۔ میں نے سوچا ہوٹل پہنچ کر اُن سے کرائے کا پتہ کروں گا تا کہ یہ مجھے زیادہ چارج نہ کرے۔

امریکہ کی طرح اسرائیل میں بھی ٹریفک دائیں ہاتھ چلتی ہے۔ مین شہروں کو ملانے والے فری وے بھی تقریبا امریکہ کی طرح ہی ہیں۔ فری ویز پر بورڈ بھی امریکہ کی طرح ہیں جن پر شہروں کے نام عبرانی، عربی اور انگریزی میں لکھے ہیں۔ یروشلم کا نام بورڈوں پر کئی طرح لکھا ملا۔ عربی میں کم از کم اُس کی دو شکلیں تھیں۔ یروشلم اور القدس۔ جبکہ انگریزی میں جروشلم اور عبرانی میں صرف اوروشلیم لکھا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ موصوف فلسطینی نہیں بلکہ یہودی ہے۔ اُس کی رہائش گاہ تل ابیب میں تھی اور وہ گزشتہ ستائیس سال سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔ یروشلم جاتے ہوئے راستے میں اُسے دو تین بار فون کال بھی آئی جس کے بارے میں اُس نے بتایا کہ وہ اُس کی بیوی کی کال تھی۔ کال آنے پر ہر بار اُس نے گفتگو عبرانی میں کی۔ زبانوں کے بارے میں اُس نے بتایا کہ اُسے پانچ زبانیں آتی ہیں۔ عبرانی، عربی، انگریزی، روسی اور ہسپانوی۔ اپنی فیملی کے بارے میں اُس نے بتایا کہ اُس کے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹا سب سے بڑا ہے۔ بیٹیاں اُس سے چھوٹی ہیں۔ دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ جبکہ بیٹا ابھی کنوارہ ہے۔

میرے استفسار پر اُس نے اپنے بیٹے کے بارے میں بتایا کہ وہ بھی اُس کی طرح ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اور یہیں تل ابیب میں ٹیکسی چلاتا ہے۔

بن گورین انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے یروشلم جاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ فضا سے میں نے اسرائیل کا جو امیج اپنے ذہن میں بنایا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔

اسرائیل کھجور کی گٹھلی جیسی چھوٹی سی بے مایہ ریاست نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی ریاست تھی۔ جس کا اپنا ایک نظام تھا۔ اپنا ایک جغرافیہ تھا۔ اپنا ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ تل ابیب فضا سے ایک صحرائی شہر دکھائی دیتا تھا۔ لیکن یروشلم تک کا سارا راستہ پہاڑوں اور چھوٹے چھوٹے میدانوں کا راستہ تھا۔ جس پر جگہ جگہ پہاڑی علاقوں جیسی کھیتی باڑی کی گئی تھی۔ کئی جگہ پہاڑوں پر جنگلی درخت اُگائے گئے تھے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فطرتی جنگل نہیں بلکہ مصنوعی جنگل ہیں جنہیں دستِ فطرت نے نہیں بلکہ دستِ انسانی نے کاشت کیا ہے۔

اِس سے اسرائیلی ریاست کا عزم ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے زیرِ تسلط علاقے کا انسانی و فطرتی لینڈ اسکیپ مکمل طور پر تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ بن گورین انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے یروشلم جاتے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں پر اگر مصنوعی جنگل اُگانے کی کوششیں نظر آتی ہیں تو سارے فلسطین میں یہودی آبادکاروں کے لئے جگہ جگہ یورپی اسٹائل میں تعمیر کی گئی بستیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں جن کا واضح مقصد عرب آبادیوں کو اِس طرح محصور کرنا ہے کہ رفتہ رفتہ اُن کے لئے زندہ رہنے کے امکانات تقریباً مسدود ہوتے جائیں تاکہ وقت کے ساتھ اُن کا خود بخود صفایا ہو جائے یا وہ اسرائیل چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔

اِس مقصد کے حصول کے لئے عرب علاقوں میں صرف یہودی آبادکاروں کی بستیاں ہی نہیں تعمیر کی گئیں بلکہ عرب آبادیوں کے ارد گرد ایسی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہے کہ اُن کا رابطہ اسرائیلی آبادیوں سے مکمل طور پر منقطع ہو گیا ہے۔ اِس مقصد کے لئے غزہ اور اسرائیل کے درمیان کھڑی کی گئی دیوار کو تو یو این اور دیگر بین الاقوامی ادارے جانتے ہیں اور بین الاقوامی برادری کو بھی اِس کا علم ہے لیکن ایسی

کئی اور دیوارِیں ہیں جن کے بارے میں بین الاقوامی برادری کچھ نہیں جانتی۔ وہاں رہنے والے عربوں کا حال غزہ کے رہائشیوں سے کچھ کم ابتر نہیں۔

میں بات کر رہا تھا اپنے یہودی ٹیکسی ڈرائیور کی جو مجھے ائیر پورٹ سے اٹھا کر میرے ہوٹل چھوڑنے جا رہا تھا لیکن راستے میں مصنوعی جنگلات سے بات اسرائیل میں فلسطینی علاقوں میں یہودی سیٹل مینٹس کی طرف نکل گئی۔

ائیر پورٹ سے نکلنے کے بعد گاڑی تقریباً پنتالیس منٹ فری وے پر دوڑتی رہی اور پھر یروشلم کی حدود میں داخل ہو گئی۔

نیا یروشلم کسی بھی حوالے سے دنیا کا جدید شہر ہے۔ بلند و بالا عمارتیں، کشادہ دو رویہ سڑکیں، سڑکوں کے ارد گرد قد آور گھنے درخت، ٹریفک کا جدید نظام، سڑکوں پر چلنے والی خوبصورت ٹرامیں، مغربی لباس میں ملبوس لڑکیاں، لڑکے اور خواتین و حضرات دیکھ کر نئے یروشلم پر مغربی ملک کے شہر کا گمان گزرتا ہے۔

اسرائیل نے کئی سال پہلے یروشلم کو اپنا دارالسلطنت ڈکلیر کیا تھا۔ کئی اسلامی ملکوں نے اِس پر احتجاج بھی کیا تھا۔ اب بھی دنیا کے بہت سے ممالک یروشلم کو اسرائیل کا دارالسلطنت تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن میرے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی کہ یروشلم اسرائیل کا دارالسطنت ہے۔ مجھے اِس بات کا اُس وقت دوبارہ خیال آیا جب ٹیکسی ڈرائیور نے ایک بہت بڑی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ اسرائیلی وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ رہائش گاہ کے ارد گرد پولیس نے سکیورٹی لائنز کھڑی کر رکھی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسرائیل کا آج کل وزیر اعظم کون ہے۔ میرے استفسار پر ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ آج کل اسرائیل کا وزیر اعظم بی بی نتین یاہو ہے۔ بی بی نتین یاہو کا نام سن کر میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے میری بے ساختہ ہنسی کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کسی وقت نتین یاہو امریکہ میں اسرائیل کا سفیر تھا۔ اُس وقت وہ دائیں بازو کے امریکی دقیانوسیت پسند میڈیے کا انتہائی پسندیدہ مبصر تھا۔ مڈل

ایسٹ کے حالات پر تبصرے کے سلسلے میں وہ ہمیشہ میڈیے پر رہتا تھا۔ ہمیں اکثر اُس کے خیالات و نظریات سننے کو ملتے تھے۔ اُس کے اُن تبصروں کی وجہ سے اُسے ہم شاید اسرائیلیوں سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ڈرائیور نے گاڑی ایک ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پارک کی۔ ہوٹل کی پیشانی پر لکھا تھا پینوراما ہوٹل۔

لیکن اِس ہوٹل کی عمارت مجھے اُس پینوراما ہوٹل سے نختلف دکھائی دی جو میں نے انٹرنیٹ پر دیکھی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا مجھے یہ ہوٹل مختلف دکھائی پڑتا ہے۔ اُس نے کہا سارے یروشلم میں یہی ایک پینوراما ہوٹل ہے جسے میں جانتا ہوں۔

پاس ہی مجھے ایک اور ٹیکسی ڈرائیور دکھائی دیا۔ وہ شکل و صورت سے فلسطینی لگتا تھا۔ اُس نے کہا ہاں یہ پینوراما ہوٹل اُس ہوٹل سے مختلف ہے جہاں تمہیں جانا ہے۔ وہ پینوراما ہوٹل پُرانے یروشلم کے علاقے راس الامود میں واقع ہے۔ راس الامود کا نام سنتے ہی یہودی ٹیکسی ڈرائیور نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ وہاں جانے سے یہودی ہونے کی وجہ سے اُسے قتل کیا جاسکتا ہے۔

پھر اُس نے میرا سامان اُٹھا کر فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور کی ٹیکسی میں رکھا مجھ سے ساڑھے چار سو شیکل لے کر فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور کو پچاس شیکل دیے اور اُس سے استدعا کی کہ وہ مجھے راس الامود والے پینوراما ہوٹل تک پہنچا دے۔

اِس سے پہلے کہ فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور کوئی جواب دیتا یہودی ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی گیئر میں ڈالی اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔ فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور نے جلدی سے اُس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور پھر مجھے کہنے لگا کہ وہاں سے راس الامود کے ستر شیکل بنتے ہیں۔ وہ مجھے پچاس شیکل دے گیا ہے۔ میں اس صورت حال سے خاصہ بے زار ہوا۔ میں نے اُسے بیس شیکل اور دیے اور اُس سے استدعا کی کہ وہ مجھے پینوراما ہوٹل پہنچا دے۔

بیس شیکل اور وصول کرنے کے بعد فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور پُرانے یروشلم میں واقع راس الامود کی طرف چل پڑا۔ اِس طرح جوں توں کرکے میں پانچ بجے کے قریب راس الامود والے پینوراما ہوٹل پہنچا۔

پینوراما ہوٹل کا استقبالیہ کلرک ایک خاصہ خوش اخلاق فلسطینی نوجوان تھا۔ اُس کی ساری تعلیم کینیڈا میں ہوئی تھی۔ اپنے کینیڈا کے قیام کے دوران وہ امریکہ بھی کئی بار جا چکا تھا۔ وہ سان فرانسسکو، ایل اے اور لاس ویگاس جا چکا تھا۔ اُس کا نام عبدالرحیم تھا۔

اُس نے مجھے انتہائی تپاک سے ہوٹل میں خوش آمدید کہا۔ رسمی کاروائی کرکے کمرے کی چابی میرے حوالے کی۔ اِس سے پہلے کہ میں چابی پکڑ کر اپنے کمرے میں جاتا ائیر پورٹ سے اُس ڈرائیور کی کال تھی جسے ہوٹل والوں نے مجھے رسیو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ عبدالرحیم سے کہہ رہا تھا کہ اُس فلائٹ کے سب پیسنجر جا چکے ہیں اور مجھے مسٹر اشرف کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔

ڈیسک کلرک نے اُسے بتایا کہ مسٹر اشرف تو ہوٹل پہنچ چکے ہیں اِس لئے وہ ازراہِ کرم واپس آ جائے۔ میں نے کمرے میں جا کر سامان رکھا۔ گرم پانی سے غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے ایک بلاک کے فاصلے پر مسجدِ اقصیٰ کا سرمئی اور ڈوم آف دی راک کا سونے کی طرح چمکتا سنہری گنبد دکھائی دیا۔ میں کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑا دونوں گنبدوں کو دیکھتا رہا۔

اسرائیل آنے کے لئے میں امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں اتوار کی صبح چار بجے بستر سے اٹھ کر ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اب یروشلم میں سوموار کا سورج غروب ہو رہا تھا۔

میں نے سرمئی و سنہری گنبدوں کو دیکھتے تھوڑی دیر ستانے کے لئے سر سرہانے پر رکھا تو کھلی کھڑکی سے یروشلم کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے نیند کی وادیوں میں دھکیل دیا۔ رات بھر گہری نیند سویا رہا۔ صبح اُٹھا تو اسرائیل میں آئے مجھے دوسرا دن ہو رہا تھا۔

ڈوم آف دی راک کا قریبی دیوار کے باہر سے منظر

ڈوم آف دی راک میں داخل ہونے کا ایک راستہ

اسرائیل میں دوسرا دن

اسرائیل میں پہلا دن اِس طرح گزارنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا ہوٹل پہنچتے ہی نہا دھو کر کپڑے بدلوں گا۔ کچھ کھانے کی طلب ہوئی تو ہوٹل کی بالائی منزل پر بنے ریستوران میں کچھ کھاؤں گا۔ پھر مسجد اقصیٰ اور ڈوم آف دی راک کی زیارت کے لئے جاؤں گا۔ وہاں کچھ دیر قیام کروں گا۔ پھر ہوٹل آ کر سو جاؤں گا اور اگلے دن باقی سیاحتی مقامات کے لئے نکلوں گا۔ لیکن فطرت انسان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ فطرت نے میرے سارے منصوبے اِس طرح تبدیل کئے کہ میں رات کا کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ اور سویا بھی تو اِس طرح گھوڑے بیچ کر کہ اگلے دن صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔

ہوٹل میں ناشتہ صبح سات سے نو بجے تک فری ہوتا ہے۔ اِس کے بعد ناشتہ بند کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی شاور لیا، کپڑے بدلے، اور ہوٹل کے چھٹے فلور پر ناشتے کے لئے پہنچ گیا۔ اِس فلور پر تین اطراف بڑے بڑے شیشوں کی کھڑکیاں اِس طرح لگائی گئی ہیں کہ سارا پُرانا یروشلم ایک پیالے کی طرح ہوٹل کے چاروں طرف نظر آتا ہے۔

یروشلم جس پہاڑی سلسلے پر واقع ہے اُسے انگریزی میں جوڈین ماونٹینز اور عربی میں جبال الخلیل کہتے ہیں۔ جبال الخلیل اور جبال الحبیران اسرائیل کا پہاڑی سلسلہ جو بحر روم سمندر کے ساحلی میدانوں سے لیکر ویسٹ بینک میں بحر مردار تک پھیلا ہے۔ رام اللہ، مغربی یروشلم جسے نیا یروشلم بھی کہا جاتا ہے اور مشرقی یروشلم جسے پرانا یروشلم بھی کہتے ہیں جبال الخلیل پر واقع ہیں۔ بیت الحم اور حبران بھی اِسی پہاڑی سلسلے پر واقع ہیں۔

تل ابیب اور یافا جو کہ بحر روم کے ساحلی میدانوں پر واقع ہیں سے یروشلم کی طرف سفر کریں تو ابتدا میں پہاڑ مٹی اور پتھروں سے بنے دکھائی دیتے ہیں لیکن یروشلم سے بحر مردار کی طرف بڑھیں تو پہاڑوں

کی ساخت میں سے پتھر تقریباً غائب ہو جاتے ہیں۔ مٹی کا انتہائی دودھیا رنگ اُس میں چونے کی با افراط موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔

جبال الخلیل کی وجہ تسمیہ حضرت ابراہیم کا لقب الخلیل ہے۔ الخلیل کا مطلب ہے خدا کا دوست۔ حضرت ابراہیم کی نسبت ہی کی وجہ سے شہر حیبران کو بعض اوقات الخلیل بھی کہا جاتا ہے۔

ہوٹل کے ایک طرف جبل الزیتون ہے جسے انگریزی میں ماونٹ آف آلیو کہا جاتا ہے۔ جبل الزیتون کو اُس پہاڑ پر بہت زیادہ زیتون کے درختوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ایک طرف جبل الطور ہے۔ لیکن یہ وہ جبل الطور نہیں جہاں جا کر حضرت موسیٰ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے۔ وہ طور دشت سینا میں ہے جو کہ مصر میں واقع ہے۔ جبل الطور کے ساتھ ہی شہر داود ہے۔ اُس سے آگے جبل المکبرّ ہے۔ جبل المکبرّ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کی خلیفہ دوم حضرت عمر بن الخطاب اِس طرف سے بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے۔ اِس پہاڑ سے جب انہیں مسجدِ اقصیٰ دکھائی دی تھی تو انہوں نے وہاں کھڑے ہو کر باآواز بلند تکبیر کہی تھی جس کی وجہ سے اِس پہاڑ کا نام جبل المکبرّ پڑ گیا تھا اور اب تک وہاں آباد عرب مسلمان اُسے جبل المکبرّ کہہ کر ہی بلاتے ہیں۔

ناشتے سے پہلے میں کافی دیر تک تینوں طرف کھلنے والی قد آور کھڑکیوں کے شیشوں سے شہرِ پُر جمال شہر الانبیا کے حسن سے مبہوت و مسحور اُس کا جائزہ لیتا رہا۔

ہوٹل کی کھڑکیوں کے چاروں طرف پھیلے یروشلم کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں اِس شہر کی تاریخ کے کئی باب کھلے اور بند ہوئے۔ مجھے محسوس ہوا میرے سامنے یروشلم نہیں ہزاروں سالوں کی تاریخ کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ جن پر لکھے واقعات دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔

یروشلم ایسا شہر ہے جسے تینوں الہامی مذاہب کے ماننے والے مقدس جانتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی تو یروشلم کو اپنا سب سے مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لئے بھی قبلہ اول اور رسولِ پاک کے سفر معراج کا پہلا مقام ہونے کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں سے کم مقدس نہیں۔

یروشلم کو اپنی دو ہزار سالہ تاریخ میں تقریباً اس علاقے میں سب فاتح قوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کنعانیوں، مصریوں، ایرانیوں، رومنوں، عربوں، عثمانیوں اور انگریزوں نے حکومت کی اور اپنی اپنی تہذیب کے اثرات یروشلم پر چھوڑے۔ لیکن آرمینیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے اثرات یروشلم پر سب سے زیادہ گہرے ہیں۔ اِس وقت عملی طور پر تہذیبی اعتبار سے یروشلم انہی چار گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے پرانا یروشلم ایک اسلامی شہر دکھائی دیتا ہے۔

میں ہوٹل کے چھٹے فلور پر واقع ریستوران کی کھلی کھڑکیوں سے یروشلم دیکھتے ہوئے یہ سب باتیں سوچ رہا تھا اور کھڑکیوں سے باہر تیز ہوا مسلسل شور کر رہی تھی۔ ہوا کے شور میں مجھے نالہ و شیون کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ مجھے لگا جیسے ہوا ماتم کر رہی ہو۔ لیکن کیوں اور کس کا ماتم؟ شاید اُن حملہ آوروں کا جو بار بار اِس شہر کی حرمت کو پامال کرتے رہے ہیں۔

دراصل پُرانے یروشلم کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ وہاں تقریباً ہر وقت تیز ہوا اِسی طرح چلتی رہتی ہے۔ کھڑکی کھولیں تو تیز ہوا کے پھریرے کمرے میں در آتے ہیں اور ہوا کا نالہ و شیون بند ہو جاتا ہے۔ لیکن کھڑکی بند کریں تو تیز ہوا کی فریاد کی لے پھر سے سُنائی دینے لگتی ہے۔

یروشلم میں بھی چاروں موسم اپنے اپنے وقت پر اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ گرمیوں میں تیز چلنے والی ہوا خوشگوار اثر چھوڑتی ہے جبکہ سردیوں میں یہ ہوا سردی کی شدت میں اضافہ کر دیتی ہے اور ساکنانِ یروشلم کے لئے اذیت و آزار کا سبب بنتی ہے۔

ہوا کے شور و شغب کے باوجود ہوٹل کے چھت پر واقع ریستوران کی کھڑکیاں بند رہتی ہیں۔ ہوا کی فریاد کی لے کے باوجود اُنہیں کھولا نہیں جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایک آدھ کھڑکی کھولی جائے تو ہوا کا نالہ و شیون یقیناً رُک جائے گا لیکن ریستوران کے اندر کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

ریستوران کے بیرے نے مجھے شہر کے حسن و جمال میں کھوئے دیکھا تو کہنے لگا سر ناشتہ کر لیں ورنہ ہم سامان اٹھانے جا رہے ہیں۔

میں نے جلدی سے پلیٹ لے کر عربی اور انگریزی خوراک کے پسندیدہ آئٹم اِس میں ڈالے اور جبل الزیتون کی طرف کھڑکیوں کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ ناشتے میں میری نگاہیں اب بھی مسلسل شہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ڈوم آف دی راک کا سنہری گنبد سورج کی کرنوں میں پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اُس کے پہلو میں مسجد اقصیٰ کا سرمئی گنبد اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ لیکن اپنی یہ کیفیت اور عالم تھا کہ: صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے۔ طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے۔

ہوٹل کی کھڑکی سے جبل الزیتون کا منظر

ہوٹل کی کھڑکی سے یروشلم کا ایک اور منظر

2

ناشتے سے فارغ ہو کر نیچے ہوٹل کی لابی میں آیا تو استقبالیہ ڈسک کے کلرک نے مجھے بتایا کہ ائیر پورٹ والا ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہے۔

وہ لابی ہی میں ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرے نام کا کتبہ اب بھی اُس نے اپنے ہاتھ میں اُٹھا رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے وہیں صوفے پر تشریف رکھنے کے لئے کہا۔ میرا اشارہ دیکھتے ہی وہ خاموشی سے دوبارہ اُسی صوفے پر بیٹھ گیا۔

دراصل اُس سے بات کرنے سے پہلے میں چند لمحے سوچنا چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھ کیسے انصاف کیا جائے۔ کل اُس کی وجہ سے مجھے یروشلم میں دو ڈرائیوروں کے ساتھ جس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اُس سے میں خاصہ ملول تھا۔ لیکن اِس میں اگر کچھ قصور میرا تھا تو کچھ اُس کا بھی تھا۔

اُسے میرے کہنے پر ہوٹل والوں نے ائیر پورٹ پر آنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن وہ ائیر پورٹ آیا تھا یا نہیں میں نہیں جانتا تھا۔ آیا تھا تو مجھے کیوں نظر نہیں آیا۔ اِس کا اُس کے پاس یہ جواب تھا کہ اُس نے جہاں گاڑی پارک کی تھی اُس کے لئے اُسے مسلسل ائیر پورٹ کے اندر باہر آنا جانا پڑ رہا تھا۔ اِس وجہ سے اُس نے مجھے اور میں نے اُسے مِس کیا۔

کل مجھے یہودی ڈرائیور جس عرب ڈرائیور کے حوالے کر گیا تھا اُس سے میں نے اپنے اگلے دن کے پروگرام کے حوالے سے کرایہ پوچھا تھا۔

میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں صبح جبل الزیتون جانا چاہتا ہوں۔ اُس کے بعد حضرت ابراہیم کے مقبرے کی زیارت کے لئے حیبران جاؤں گا۔ واپسی پر حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبرے پر حاضری دوں گا۔ اِس کے بعد مسجد اقصیٰ رُکوں گا۔ وہ مجھے مسجد اقصیٰ اتار دے میں مسجدِ اقصیٰ اور ڈوم آف دی راک کی

زیارت کے بعد پیدل ہوٹل چلا جاؤں گا۔ اُسے میرے لئے وہاں رُکنے یا میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

اُس کا اندازہ تھا کہ یہ سارا چار یا ساڑھے چار گھنٹے کا ٹرپ ہو گا اور وہ اِس کے ڈھائی سو ڈالر چارج کرے گا۔ مجھے اب تک اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ مول تول کا کلچر ہے۔ چنانچہ میری توقع کے عین مطابق کم زیادہ کے چکر میں ہوٹل پہنچنے تک وہ دو سو ڈالر تک آ چکا تھا۔

میں نے صوفے پر بیٹھے ڈرائیور سے اُس کا نام پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا نام عزیز ہے۔ لیکن لوگ اُسے ابو علی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

میں نے اُس سے کہا کہ میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی علی ہے اِس لئے میں بھی ابو علی ہوں۔ اگر چاہے تو وہ مجھے بھی ابو علی کہہ کر مخاطب کر سکتا ہے۔ مجھے اِس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

میری بات سُن کر وہ ہنس پڑا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا وہ ائیر پورٹ سے چار سو شیکل چارج کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اُسے چار سو شیکل ادا کروں۔ کیونکہ وہ میرے کہنے پر مجھے اُٹھانے کے لئے ائرپورٹ پر گیا تھا۔

"ابو علی پھر کیا تم نے مجھے ائیر پورٹ سے اُٹھایا؟" میں نے اُس سے پوچھا

"نہیں، میں نے آپ کو نہیں اٹھایا کیونکہ آپ وہاں تھے نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"ابو علی دیکھو اگر میں ائیر پورٹ پر نہیں تھا تو پھر یہاں کیسے آ گیا ہوں؟" میں اُسے تھوڑا سا تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ "اور دیکھو تمہاری وجہ سے میں نے اُس یہودی کے بچے کو پچاس شیکل زیادہ ادا کئے ہیں۔ اب میں تمہیں چار سو شیکل اور کیسے ادا کروں؟" وہ میری دلیل سُن کر کچھ نرم پڑا۔

میں نے اُسے نرم پڑتے دیکھ کر کہا "میں اِس وقت یروشلم میں جبل الزیتون، نبی داؤد علیہ السلام اور حیبران میں نبی ابراہیم علیہ السلام کے ہاں حاضری دینا چاہتا ہوں اگر چلنا چاہتے ہو تو پیسے بتاو۔" اُس نے

کہا: "میں اِس ٹرپ کے ایک سو بیس ڈالر یا پانچ سو شیکل لوں گا اور حیبران کے راستے میں ہی بیت الحم بھی پڑتا ہے آپ کو وہاں بھی لے جاؤں گا۔"

میں نے سوچا رات والا ڈرائیور اِس ٹرپ کے دو سو ڈالر مانگ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اِس ٹرپ میں بیت الحم بھی شامل نہیں کر رہا تھا۔ یہ ایک سو بیس ڈالر میں باقی جگہوں کے علاوہ بیت الحم بھی لے جائے گا یہ زیادہ معقول آدمی لگتا ہے اس لئے اسے باقی دنوں کے لئے بھی رکھ لو تو بہتر رہے گا۔

میں نے اُس کو لُبھاتے ہوئے کہا: "دیکھو ابو علی تم ائیر پورٹ آئے میں تمہیں نہیں ملا۔ اِس میں آدھا قصور میرا ہے اور آدھا تمہارا۔ اس لئے میں تمہیں دو سو شیکل ادا کروں گا۔ اِس کے علاوہ تمہارا آج کا لنچ تمہاری پسند کے ریستوران پر میرے ذمہ۔ اب تم مجھے جبل الزیتون، نبی داود علیہ السلام، الخلیل اور بیت الحم لے چلو۔"

وہ میرے فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا "میں تیار ہوں۔"

میں نے کہا "میں بھی تیار ہوں۔"

کہنے لگا "لیکن الاقصیٰ تو یہاں پہلو میں ہے۔ کیا پہلے یہاں حاضری نہیں دو گے؟

" میں نے کہا "اگر آج باقی زیارتوں سے جلدی لوٹ آئے اور مجھ میں ہمت ہوئی تو مجھے وہاں اُتار دینا ورنہ میں کل صبح خود مسجد چلا جاؤں گا۔ مسجد بھی دیکھو گا اور گنبد صخرا بھی۔"

معاوضہ طے ہو جانے کے بعد عبد العزیز نے گاڑی میں ڈرائیور سیٹ سنبھالی اور میں اُس کے ساتھ پیسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم ہوٹل سے تھوڑی ہی دور مسجد اقصیٰ کے سامنے واقع جبل الزیتون کی سمت روانہ ہو گئے۔

جبل الزیتون میں داخلے کا راستہ

3

جبل الزیتون ہوٹل اور مسجد اقصیٰ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ ہم دس منٹ گاڑی چلانے کے بعد جبل الزیتون پہنچ گئے۔ لیکن جبل الزیتوں سے کچھ فاصلے پر عزیز نے ایک احاطہ میں گاڑی کھڑی کی۔ احاطہ میں دائیں جانب ایک بر آمدہ بنا تھا۔ بر آمدے کے دائیں ہاتھ کچھ سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں۔ پتہ چلا اُن سیڑھیوں کے اوپر مسلمانوں کا قبرستان ہے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھ کر قبرستان میں فاتحہ خوانی کی۔ کئی قبریں کئی صدیاں پرانی تھیں۔ اُن پر عربی نام عربی انداز میں لکھے تھے۔ یعنی قبر میں مدفون شخص کا شجرہ نسب بھی اُس کے نام کے ساتھ رقم تھا۔

قبرستان میں فاتحہ پڑھ کر سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو بر آمدے میں ایک شخص اینٹوں سے بنے فلور پر سجدے والی جگہ گتے کا ایک ٹکڑا رکھے نفل ادا کر رہا تھا۔ وہ شکل وصورت سے فلسطینی دکھائی دیتا تھا۔

بر آمدے کے ساتھ ہی بائیں جانب ایک کمرہ تھا۔ لگتا تھا کمرے کے اندر مسجد ہے جس میں ایک طرف ایک قبر ہے۔ عزیز نے بتایا کہ یہ صحابی رسول حضرت سلمان فارسی کی قبر ہے۔ یہ مسجد حضرت سلمان فارسی کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی اِسے مسجدِ سلمان فارسی کہا جاتا ہے۔ اُس وقت مسجد کا دروازہ بند تھا۔ میں نے وہیں مسجد کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر حضرت سلمان فارسی کے لئے دعائے فاتحہ پڑھی۔ مسجد سلمان فارسی سے نکلنے کے بعد ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر چند منٹ بعد ماونٹ آف آلیو میں داخل ہوئے۔

ماونٹ آف آلیو میں داخل ہوتے ہی ایک انتہائی قدیم گنبد نما گول شکل کا کوئی بیس فٹ اونچا اسٹرکچر کھڑا ہے۔ ہم سے پہلے سیاحوں کا ایک گروہ ایک خاتون گائیڈ کے ساتھ کھڑا اُس اسٹرکچر کے بارے میں عبرانی زبان میں اُس کی بیان کردہ تفصیل سن رہا تھا۔

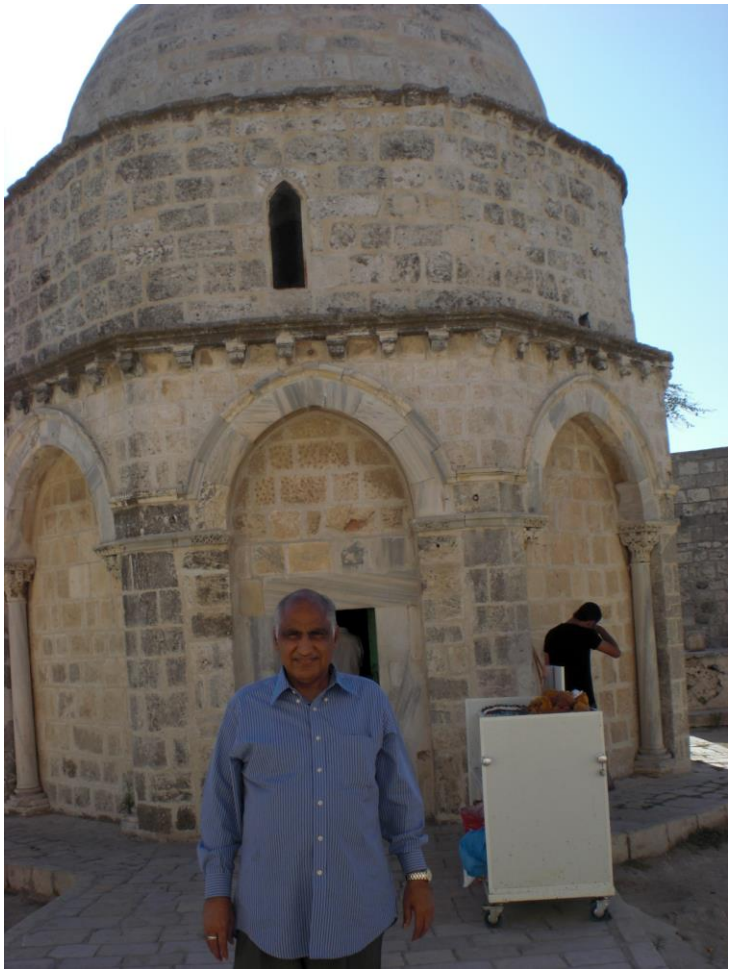

جبل الزیتون پر بنا گنبد نما ڈھانچہ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کھڑے ہو کر واعظ فرمایا کرتے تھے۔
مسلمانوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اِسی جگہ سے
آسمانوں پر اُٹھایا گیا تھا

میں نے اُس اسٹرکچر کے بارے میں پوچھا۔ عزیز نے بتایا کہ نبی عیسیٰ علیہ السلام اِس جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کو خدا کا پیغام سنایا کرتے تھے۔

اِس اسٹرکچر کے حوالے سے حضرت عیسیٰ ہی کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب رومنوں نے اُنہیں دار پر چڑھانے کا فیصلہ کیا تو آخری بار وہ اِس جگہ دکھائی دیے اور انہیں یہاں سے آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔

اِس گنبد نما اسٹرکچر کے ارد گرد یہودیوں کی ہزاروں سال پرانی قبریں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں پر ڈیڑھ لاکھ یہودی دفن ہیں۔

سارے قبرستان میں پوری پہاڑی پر زیتون کے درخت ہیں جس کی وجہ سے اُسے انگریزی میں ماونٹ آف آلیو اور عربی میں جبل الزیتون کہا جاتا ہے۔ ہمیں ماونٹ آف آلیو پر آتے آتے تقریباً دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے عزیز سے پوچھا کہ حیبران یروشلم سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اُس نے کہا حیبران پہنچتے ہمیں ایک بج جائے گا۔

میں نے کہا ہمیں نبی داود علیہ السلام کے روضے پر واپسی پر حاضری دینی چاہئے یا ہم کل بھی وہاں جاسکتے ہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُن کا روضہ یروشلم میں ہمارے راستے میں پڑتا ہے ہم حیبران جاتے ہوئے وہاں رُکتے جائیں گے۔

اُس کا کہنا بجا تھا۔ ہم ماونٹ آف آلیو سے نکلے تو تھوڑی دیر گاڑی چلانے کے بعد ایک جگہ سٹی آف ڈیوڈ کا سائن دکھائی دیا۔ انگریزی میں داؤد کو ڈیوڈ کہا جاتا ہے۔ ہم سٹی آف ڈیوڈ سے تھوڑا آگے گئے تو ہمیں ایک دیوار پر ڈیوڈ کی قبر کا چھوٹا سا کتبہ دکھائی دیا۔

وہیں پاس ہی پارکنگ کے لئے چھوٹی سی جگہ بنائی گئی تھی۔ وہاں گاڑی پارک کرنے کی پچیس شیکل ٹکٹ تھی۔ گاڑی پارک کر کے ہم نے فٹ پاتھ پر چالیس پچاس قدم اٹھائے ہوں گے کہ ہمیں بائیں ہاتھ پتھر

کی بنی سیڑھیاں ایک پرانی عمارت کی طرف اوپر جاتی دکھائی دیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر عمارت میں داخل ہوئے تو یہ پرانی وضع کا ایک بلند و بالا کمرہ تھا جو ایک چھوٹے سے در سے ایک مختصر ہال وے سے منسلک تھا۔ وہاں بھی سیاحوں کا ایک گروہ اپنی گائیڈ سے عبرانی میں داؤد علیہ السلام کے بارے میں تفصیلات سن رہا تھا۔

ہم گروہ کے درمیان سے گزرتے آگے بڑھے تو ایک کرسی پر کالے رنگ کا یہودیوں والا مخصوص کوٹ اور ہیٹ پہنے ایک یہودی بیٹھا تھا۔ ہم اُس سے آگے گزرے تو دائیں ہاتھ چھوٹے سے ایک کمرے میں حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر تھی۔ قبر پر چوکھٹا بنا کر اُس پر شنیل کا غلاف رکھا تھا۔ غلاف پر شفاف پلاسٹک لٹکا رکھا تھا کیونکہ پاس ہی روضے کے لئے پتھر کا کام ہو رہا تھا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں پلاسٹک ختم ہو رہا تھا۔ اور غلاف کے نیچے حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر قبر مبارک اور اُس کے اوپر پڑے غلاف کو چھوا اور پھر ہاتھ اُٹھا کر پہلے درود اور پھر فاتحہ پڑھی۔

فاتحہ پڑھ چکا تو میں نے دیکھا ہمارے پیچھے کھڑے یہودی سیاحوں کا گروہ اپنی گائیڈ سمیت حیرت و استعجاب سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ منتظر تھے کہ ہم فاتحہ خوانی سے فارغ ہوں تو وہ داؤد علیہ السلام کی قبر مبارک والے کمرے میں داخل ہوں۔

ہم حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر مبارک سے ہٹے تو اُنہوں نے ہمیں کمرے سے نکلنے کا راستہ دیا۔ چھوٹے سے ہال وے میں کالے اوور کوٹ اور اونچے ہیٹ والا یہودی اب بھی اُسی کرسی پر بیٹھا اُسی طرح ہال وے کے فلور کو گھور رہا تھا۔ ہم دوبارہ پہلے کمرے سے ہوتے ہوئے باہر آئے تو مجھے لحنِ داودی کا خیال آیا۔ لحنِ داؤدی کا خیال آتے ہی میں نے دیکھا حضرت داود کے مقبرے پر بیٹھی دو فاختائیں انتہائی سریلے انداز میں راگ الاپنے لگیں۔ مجھے پرندوں کی آوازوں میں سب سے اچھی آواز فاختہ کی لگتی ہے۔ میں خود بھی فاختاؤں کی آواز کی اتنی اچھی کاپی کر لیتا ہوں کہ بعض اوقات وہ بھی دھوکہ کھا جاتی ہیں اور جواب دینے لگتی ہیں۔

لیکن حضرت داود علیہ السلام کے مقبرے پر بیٹھی دو فاختائیں جس سریلے انداز میں بول رہی تھیں میں نے زندگی میں کبھی اور کہیں اُن کی طرح فاختاؤں کو بولتے نہیں سنا۔

داؤد علیہ السلام کے مقبرے پر بیٹھی فاختاؤں کے گیت سے میری حالت غیر ہو گئی۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبرے سے سیڑھیاں اُترنا شروع ہو گیا۔ مقبرے پر بیٹھی فاختاوں نے اپنا گیت بند کر دیا۔ میں اور عزیز گاڑی میں سوار ہو کر حیبر ان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک یہودی حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبرے سے

ملحقہ حال میں کرسی پر بیٹھا سو رہا ہے

مصنف حضرت داؤد علیہ السلام کے مقبرے پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے

قبر مبارک پر جاری پتھر کے کام کی وجہ سے پلاسٹک ڈالا گیا ہے تا کہ غلاف پر مٹی نہ پڑے

4

میرے جہاز کی کھڑکی سے بنے تاثر کے برعکس سوائے تل ابیب کے بحر روم کے ساحلی میدانوں پر واقع شہر ہونے کے اسرائیل کے زیادہ تر شہر جبال الخلیل اور جبال الحیبران کے پہاڑی سلسلوں پر واقع ہیں۔
بن گورین ائیر پورٹ کے ایک طرف تل ابیب اور جیفا ہے۔ جب کہ دوسری طرف یروشلم ہے۔ یروشلم جاتے ہوئے راستے میں کئی شہر پڑتے ہیں جو یہودیوں نے آباد کیے ہیں اور اب بھی مسلسل کر رہے۔ لیکن یروشلم کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے بائیں طرف رام اللہ ہے۔ جو لکھنے میں رام اللہ کی طرح لکھا جاتا ہے۔ جسے بعض اوقات بعض ہندوستانی رام اور اللہ کے ایک ہونے کے پراپیگنڈے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں لیکن بولنے میں رام کی م اللہ کے ساتھ ملا کر بولی جاتی ہے۔ جس سے بولنے میں را الگ اور م اور اللہ ایک آواز دیتے ہیں۔ یروشلم جانے والی فری وے سے جہاں بائیں ہاتھ رام اللہ کی عمارات دکھائی دیتی ہیں وہیں دائیں ہاتھ کوئی اسی پچاسی میل دور غزہ واقع ہے۔
بن گورین انٹرنیشنل ائیر پورٹ سے یروشلم کی طرف جائیں تو چند میل بعد پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پہاڑیاں زیادہ تر مٹی اور پتھروں کی آمیزش سے بنی ہیں۔ نیا اور پرانا یروشلم پہاڑیوں کے اِسی سلسلے پر واقع ہیں۔ حیبران اور بیت الحم بھی اِسی پہاڑی سلسلے کا حصہ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کے مقبرے سے نکلنے کے بعد حیبران تک جاتے ہوئے مجھے لینڈ اسکیپ میں کوئی واضح تبدیلی دکھائی نہ دی لیکن کئی دلچسپ مناظر دکھائی دیے۔ ایک تو حیبران کی طرف جاتے ہوئے مجھے لوگوں کے طرزِ بود و باش میں خاصی تبدیلی دکھائی دی۔
مجھے لگا کہ میں اب اسرائیلی نہیں عرب علاقے میں سفر کر رہا ہوں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے زیادہ تر خواتین اور مرد عرب دکھائی دیے۔ لیکن یہاں میں نے کسی مرد کو عرب داشے میں ملبوس نہیں دیکھا۔ سب مردوں نے پینٹیں اور شرٹیں پہن رکھی تھیں۔ شرٹیں باقاعدہ پینٹوں کے اندر تھیں۔ خواتین

نے بھی پینٹیں پہن رکھی تھیں اور اوپر کالے پتلے حجابی کوٹ پہن رکھے تھے۔ خواتین کے سر حجاب میں تھے لیکن کسی کا چہرہ ڈھانپا ہوا نہیں تھا۔ سب کے چہرے ننگے تھے۔

یروشلم سے نکلے کوئی تیس منٹ ہوئے ہوں گے ایک فلسطینی خاتون پینٹ پہنے اوپر کالا حجابی کوٹ پہنے بال حجاب سے ڈھانپے اپنے سفید خوبصورت ننگے چہرے کے ساتھ ایک توانا گدھے پر سامان باندھے سڑک پر مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ کیمرا عزیز کے پاس تھا۔ میرا جی چاہا اُس خاتون کی تصویر بنائی جائے۔ لیکن جب تک میں نے اِس خواہش کا اظہار کیا۔ گاڑی آگے گزر چکی تھی۔ عزیز نے پیچھے جانا چاہا لیکن میں نے منع کر دیا۔

جیسے جیسے ہم حیبران کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسے کئی سین دکھائی۔ کئی جگہ باربرداری کے لئے گدھے اور اونٹ استعمال ہوتے دکھائی دیئے۔

مجھے فلسطینیوں کی اِس حالت پر بہت دُکھ ہوا۔ اُن کی حالتِ زار پر بہت رونا آیا۔ کہاں ایک طرف یہ بے چارے فلسطینی اور کہاں دوسری طرف ٹیکنالوجی کی پوری طاقت سے مسلح یہودی۔ اور اُس پر مستزاد مغربی طاقتوں کی اُن کی پشت پناہی اور اُن کے شاطرانہ کھیل۔

آخر مسلمان ٹیکنالوجی سے کیوں ڈرتا ہے؟ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے اپنا رشتہ جوڑنے سے کیوں خوف زدہ ہے؟ وہ کیوں پسماندہ رہنا چاہتا ہے؟ وہ اِس قدر قناعت پسند کیوں ہے؟ وہ اپنی حالت کیوں نہیں بدلنا چاہتا؟ گاڑی پوری رفتار سے حیبران کی طرف طرف بھاگ رہی تھی اور میں اِس طرح کی بے سروپا باتیں سوچ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرا ذہن تاریخ کا میدان کارزار بن گیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا یہودی، عیسائی اور مسلمان تینوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں یا اُن کے ماننے والے ہیں۔ حیات و موت کے بارے میں اُن کے نظریات بھی ایک جیسے ہیں۔ لیکن زندگی کے بارے میں تینوں کا رویہ ایک دوسرے سے اِس قدر مختلف کیوں ہے؟ تینوں کے اپنے اپنے ڈارک اور گرے ایریاز ہیں۔ کسی کے کم کسی کے زیادہ۔ یہودی اور عیسائی اپنے ڈارک اور گرے ایریاز کو تقریباً ڈھانپ

چکے ہیں لیکن مسلمان اپنے ڈارک اور گرے ایریاز ڈھانپنے میں مسلسل ناکام ثابت ہو رہے ہیں اور یہ صرف آج ہی نہیں کئی سو برسوں سے ناکام ہو رہے ہیں۔

زندگی کی کہانی ابھی تک مسلمانوں کی گرفت میں نہیں آ رہی۔ کون ہے جو زندگی کی کہانی مسلمانوں کی گرفت میں نہیں آنے دے رہا؟ علمائے اکرام؟ صوفیائے عظام؟ برخود غلط دانشوران یا اُن کے نام نہاد جعلی راہنما؟ یا خود عام مسلمان جو لکھے ہوئے اسکرپٹ سے ذرا اِدھر اُدھر ہو کر اپنے ڈارک اور گرے ایریاز کے خوفوں سے خود کو آزاد نہیں کرنا چاہتے اور زندگی کی کہانی کو نئے سرے سے وقت کے تقاضوں کے مطابق مرتب نہیں کرنا چاہتے۔

میں انہی سوچوں میں تھا کہ گاڑی حیبران کی حدود میں داخل ہوئی۔ حیبران کی جامع مسجد کے مینار کے عقب میں حیبران کی بلند و بالا عمارات نظر آ رہی تھیں۔ سڑک کی سمت جامع مسجد کے مینار پر دو درمیانے سائز کے اسپیکر لگے تھے۔ ایک کا رُخ افقی انداز میں آبادی کی طرف تھا جبکہ دوسرے کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ اسپیکر کا رُخ اُنہوں نے آسمان کی طرف کیوں کر رکھا تھا یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اسرائیل کا رقبے اور آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا شہر یروشلم ہے۔ تل ابیب کی آبادی آدھ ملین کے قریب ہے۔ جبکہ یروشلم کی آبادی ساڑھے سات یا آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن ویسٹ بینک میں سے سے بڑا شہر احیبران ہے۔ حیبران کی آبادی تقریباً دو لاکھ کے قریب ہے۔ حیبران میں یہودی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ حیبران ویسٹ بینک کا صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔

میں نے حضرت ابراہیم کے مقبرے کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے مین روڈ پر شیشہ بنانے کی کئی بھٹیاں دیکھیں۔ میں نے چند لمحے رُک کر ایک بھٹی کے اندر جانا چاہا۔ لیکن پھر گرمی کی وجہ سے بھٹی کے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

حیبران کی سڑکوں پر گاڑی میں بیٹھے مجھے پاکستان بہت یاد آیا۔ اُسی طرح بے ہنگم ٹریفک۔ اُسی طرح سڑکوں پر بے مقصد چلتے پھرتے مرد اور عورتیں۔ اُسی طرح سڑکوں کے ارد گرد بنی الٹی سیدھی دوکانیں۔ لیکن پاکستان کی زمین کے برعکس حیبران کی زمین خاصی خشک اور پتھریلی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے زندگی میں کئی سفر کئے۔ لیکن اُن کی آخری قیام گاہ حیبران میں ہے۔ اُن کے علاوہ حضرت اسحاق، حضرت یعقوب حضرت اسحاق کی اہلیہ محترمہ اور خود حضرت ابراہیم کی اہلیہ محترمہ کی قبریں بھی حیبران میں اُن کے ساتھ ایک ہی احاطہ میں واقع ہیں۔ شہر کے جس حصے میں اُن کا اُحاطہ ہے وہاں بازار کی تنگی کی وجہ سے گاڑی نہیں جا سکتی۔

حیبران کی مین سڑک جس پر ہم آئے تھے ایک تنگ بازار پر آکر ختم ہوئی۔ وہ بازار پاکستان میں تنگ گلیوں کے بازاروں کی طرح ہے۔ جس میں ہر طرح کی دوکانیں ہیں۔ سبزی۔ منیاری۔ برتن۔ کپڑے۔ مٹھائیاں۔ زیور اور جیوس بیچنے والوں کی دوکانیں۔ بازار میں چلتے ہر اُس چیز کی مہک آتی ہے جس طرح کی دوکان کے پاس سے آپ گزرتے ہیں۔ خاصہ طویل بازار ہے۔ بازار کی کئی چھوٹی شاخیں ہیں جو بازار میں گرنے والی گلیوں میں واقع ہیں۔ ہر گلی میں بازار سے ہٹ کر کچھ دوکانیں واقع ہیں۔

ہم نے گاڑی بازار کے شروع میں مین سڑک پر کھڑی کی اور بازار میں داخل ہو گئے۔ کافی دیر بازار میں چلنے کے بعد ہم بازار کے اختتام تک پہنچے۔ وہاں آگے جانے کے لئے سلاخوں والے سرکلر گیٹ لگے تھے۔ جن سے گزرنے کے بعد سامنے وہ احاطہ ہے جس میں جد الانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی زوجہ محترمہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی زوجہ محترمہ آرام فرما ہیں۔

احاطہ میں داخلے سے پہلے اسرائیلی سکیورٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔ دو مسلح اسرائیلی فوجی ہر وقت وہاں موجود رہتے ہیں۔ احاطہ میں داخلے کے دو راستے ہیں۔ ایک طرف سے مسلمان داخل ہوتے ہیں اور دوسری

طرف سے یہودی۔ عیسائیوں کے بارے میں کیا احکام ہیں اِس کا اندازہ نہیں۔ شاید عیسائی دونوں طرف جاسکتے ہیں۔

حسب معمول اسرائیلی فوجی نے عزیز اور میرے کاغذات چیک کئے اور ہمیں مسلمانوں والے راستے سے داخلے کے لئے کہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا احاطہ سیکورٹی سے کوئی چالیس فٹ پیچھے ہٹ کے ہے۔ احاطہ تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ سیڑھیاں رفتہ رفتہ بلند ہوتی ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے احاطہ میں داخل ہوئے تو وہاں دو کشادہ اور بلند ہال بنے ہوِئے تھے۔ پہلے ہال میں کئی فلسطینی نوجوان اور معمر خواتین بچوں کے ساتھ ہال میں بچھے قالینوں پر بیٹھی تھیں۔ بچے قالینوں پر کھیل رہے تھے۔

اگلے ہال میں بھی قالین بچھے ہوئے تھے۔ اُس ہال کے اندر حضرت اسحاق کی زوجہ محترمہ کا ایک چھوٹے کمرے کی طرح روضہ بنا ہے۔ روضے پر لکھا ہے "زوجہ محترمہ سیدنا اسحاق علیہ السلام۔" اُن سے چھ سات فٹ ہٹ کر حضرت اسحاق کا بالکل اِسی طرح روضہ بنا ہے۔ دونوں روضوں میں قد آدم جالی دار دروازے ہیں جن سے اُن کی قبروں کی زیارت کی جاسکتی ہے۔

حضرت اسحاق اور اُن کی زوجہ محترمہ کے روضوں کے عین سامنے اُسی ہال میں ایک غار ہے۔ جس پر لکھا ہے "غار شریف"۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ غار عبادت کے لئے استعمال کرتے تھے۔

اُس ہال کے ساتھ الگ ایک چھوٹا ہال ہے جس میں داخل ہوتے ہی ایک کھڑکی کے اندر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر مبارک ایک طرف سے دیکھی جاسکتی ہے۔

اِسی طرح کا بندوبست دوسری طرف بھی ہے۔ حضرت یعقوب اور حضرت ابراہیم کی زوجہ محترمہ کی قبر دوسری طرف ہے۔ مسلمان اُس طرف نہیں جاسکتے۔ چنانچہ وہ اُن کی زیارت نہیں کرسکتے۔

میں نے باری باری سب کی قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ حضرت ابراہیم کے روضے کی کھڑکی کو پکڑ کر کئی بار درود پڑھا اور دنیا میں امن کے لئے دعا کی۔

مجھے حضرت یعقوب اور حضرت ابراہیم کی زوجہ محترمہ کا روضہ نہ دیکھ سکنے کا ملال تھا۔ صرف ایک دیوار حائل تھی۔ ایک طرف اسرائیل تھا اور دوسری طرف فلسطین۔ ایک طرف یہودی تھے اور دوسری طرف مسلمان۔ لیکن انسان کہیں نہیں تھا۔

میں بجھے دل کے ساتھ حضرت ابراہیم کے احاطہ سے باہر آیا تو میں نے سکیورٹی پر کھڑے اسرائیلی فوجی سے کہا "میں دوسری طرف جانا چاہتا ہوں۔"

اُس نے کہا "تم مسلمان ہو تم اُدھر نہیں جاسکتے۔" میں نے کہا "میں ایک سیاح ہوں امریکہ سے آیا ہوں۔ میرا اسلام یا یہودیت سے کوئی واسطہ نہیں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے مسلمانوں والی سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں اُدھر نہیں جاسکتا تم اِدھر نہیں جاسکتے۔" میں نے اُس سے مزید تکرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور عزیز کو وہاں سے چلنے کے لئے کہا۔

اُس وقت تک دن کے ڈیڑھ پونے دو بج چکے تھے۔ بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے عزیز سے حیبران میں کسی اچھے ریستوران کے بارے میں پوچھا۔

اُس نے کہا یہاں سے بیت الحم دور نہیں۔ وہاں ابو شنب کا بہت اچھا ریستوران ہے۔ پہلے نبی عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت کی زیارت کریں گے پھر ابو شنب میں بیٹھ کر لنچ کریں گے۔ آپ کو اُن کی خوراک پسند آئے گی۔

میں نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر ہم اُسی بازار میں چلتے گاڑی تک آئے۔ اُس نے جیوس کی ایک دوکان سے گاجروں کے جیوس کے دو گلاس پکڑے۔ ایک میرے حوالے کیا۔ ایک خود پیا۔ پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر بیت الحم کی سمت روانہ ہو گئے۔

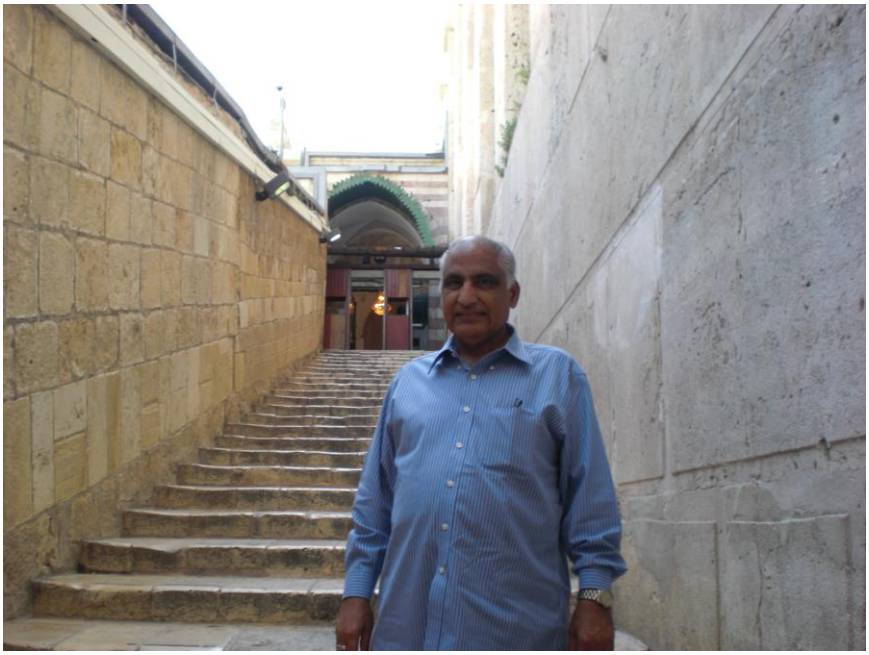

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احاطہ میں داخلے کا راستہ

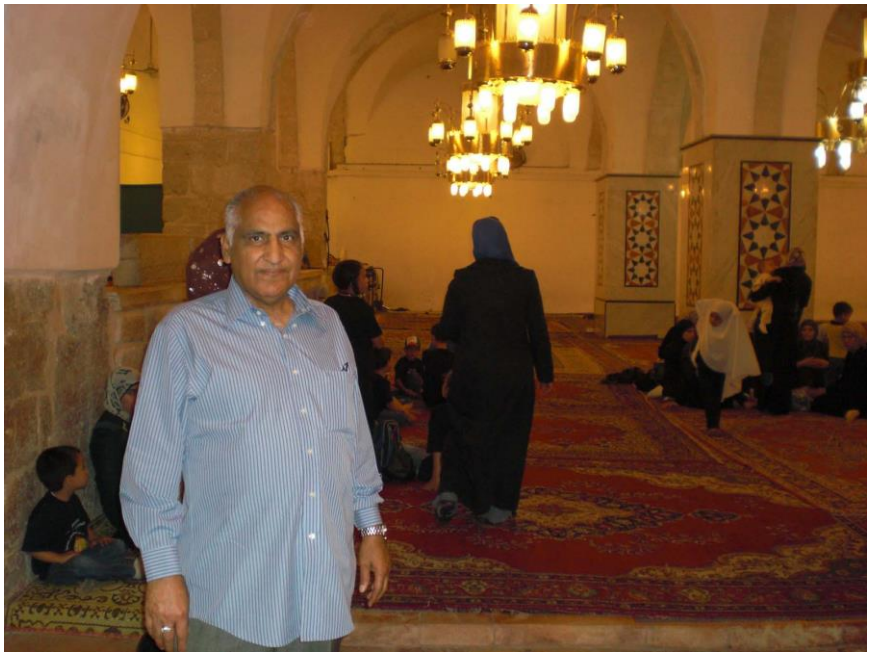

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احاطہ میں داخل ہونے کے بعد پہلا ہال

حضرت ابراہیم کے احاطہ میں پہلے ہال سے ملحقہ ہال جس میں
حضرت اسحاق علیہ السلام اور اُن کی زوجہ محترمہ کا روضہ ہے

ہال میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا مقبرہ

حضرت اسحاق علیہ السلام کے روضے پر نصب اُن کے نام کی تختی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر مبارک

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے روضے کی مسلمانوں کے حصے کی طرف کھلنے والی کھڑکی
دوسری طرف یہودیوں کے حصے کی طرف کھلنے والی کھڑکی دکھائی دے رہی ہے

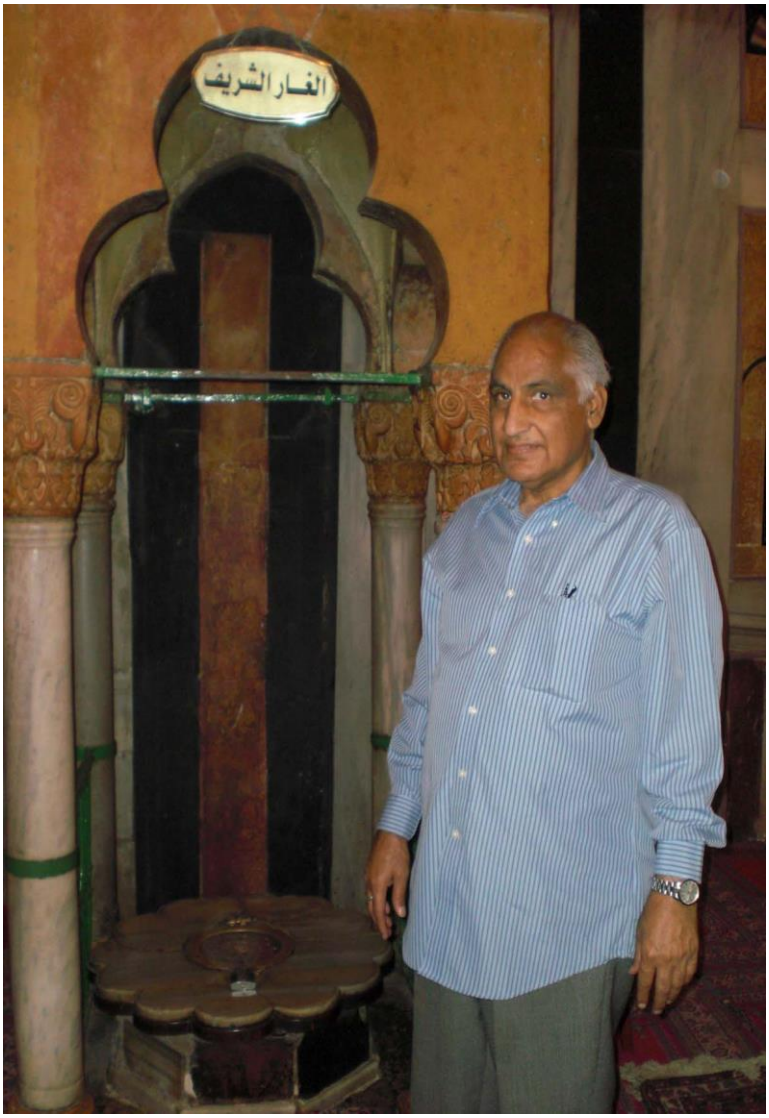

حضرت اسحاق کے روضے کے سامنے ایک غار ہے۔ کہتے ہیں اس میں
بیٹھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے

5

حیبران سے روانہ ہونے کے باوجود میرا ذہن ابھی تک حضرت ابراہیم کے روضے کی تقسیم پر اٹکا ہوا تھا۔ انسان بھی کس قدر احمق واقع ہوا ہے۔ جو چیزیں اُسے اکھٹا کر سکتی ہیں وہ انہیں بھی تقسیم کر دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم کی ذات گرامی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک کر سکتی ہے۔ بجائے اُن کے مقبرے کو تقسیم کرنے کے اگر اسرائیل حیبران کو تینوں مذاہب کے پیروکاروں کے لئے کھول دے، اِسی طرح یروشلم کو اپنا دارالخلافہ بنانے کی بجائے، اِسے تینوں مذاہب کے پیروکاروں کا اجتماعی شہر قرار دے کر سب کے لئے اوپن کر دے تو شاید مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان نفرت کم ہو جائے اور ایک دوسرے کے لئے خیر سگالی کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ ہر سال لاکھوں مسلمان زائرین اپنے اپنے ملکوں سے اسرائیل کے لئے امن کا پیغام لے کر حیبران اور یروشلم آئیں اور اسرائیل کی طرف سے امن کا پیغام لے کر اپنے ملکوں کو لوٹیں۔ لیکن لگتا ہے کہ امن کسی کے فائدے میں نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امن ہر ایک کے فائدے میں ہے۔ وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کو جس قدر امن کی ضرورت ہے کسی کو نہیں۔ پوری دنیا میں خوف اور نفرت کے شکار یہودیوں کو جس قدر امن کی ضرورت ہے کسی اور کو نہیں۔ لیکن ہے کوئی جو امن کے لئے کام کرے۔

گاڑی بیت الحم کی طرف بڑھ رہی تھی اور میرا ذہن یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے باہمی مسائل میں الجھا تھا۔ عزیز نے مجھے اِس طرح کھویا ہوا دیکھا تو کہنے لگا "اخی اگر بھوک زیادہ شدید ہے تو ہم کہیں اور رُک سکتے ہیں۔" میں نے خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ "نہیں عزیز ہم پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت دیکھیں گے اور پھر ابو شنب کے ریستوران پر لنچ کریں گے۔

اُس نے گاڑی کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ جب سے میں اسرائیل آیا تھا میں نے صرف تل ابیب سے یروشلم آتے ایک ہائی وے پولیس کی گاڑی دیکھی تھی۔ حیبران آتے اور اب بیت الحم جاتے مجھے کوئی ہائی وے پولیس کی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔

میرا خیال ہے ہمیں حیبران سے نکلے کوئی تیس منٹ گزرے ہوں گے کہ ہم بیت الحم کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ایک سڑک پر ہمیں ایک بڑا سا گیٹ بنا دکھائی دیا جس پر لکھا تھا بابِ بیت الحم۔ عزیز نے گاڑی چلاتے چلاتے بابِ بیت الحم کی تصویر بنائی اور پھر کہنے لگا "اخی آپ کو مجھ جیسا کوئی ڈرائیور پورے فلسطین میں نہیں ملے گا۔ جو اِس طرح گاڑی چلائے اور ساتھ کیمرہ مین کا کام بھی کرے۔ دراصل آپ حاجی موسیٰ کے مہمان ہیں۔ اور آپ کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔"

حاجی موسیٰ سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حاجی موسیٰ پینوراما ہوٹل کا مالک تھا۔ اُس سے اپنے ٹرپ کے حوالے سے میری کئی تفصیلی اِی میلیں تبدیل ہوئی تھیں۔ بالمشافہ ملاقات ہونا ابھی باقی تھا۔ اُس نے سب سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا ایک پاکستانی مہمان امریکہ سے آ رہا ہے۔ اُسے کسی سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ عزیز اُسی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

میں نے عزیز سے کہا "عربوں کے نام عام طور پر بہت طویل ہوتے ہیں۔ اس کا نام اتنا مختصر کیوں ہے؟" کہنے لگا "اُس کا اصل نام عزالدین محمد ہے۔ گھر والے اُسے عزیز یا ابو علی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اِس لئے وہ سب کو اپنا نام عزیز ہی بتاتا ہے۔ یہ مختصر ہے اور آسان بھی۔" میں نے کہا اُس کی سوچ ٹھیک ہے۔

اِنہی باتوں میں ہم ایک ایسی کھلی جگہ پہنچے جہاں ایک طرف چرچ تھا۔ ایک طرف ایک بڑی سی عمارت تھی جس کی پیشانی پر لکھا تھا انٹرنیشنل پیس سنٹر۔ میں نے سوچا شاید یہی حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے۔ لیکن عزیز نے سڑک کے دائیں ہاتھ ایک کریم رنگ کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ اُس نے کہا: "نبی عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش اِس عمارت کے اندر ہے۔

باقی مقدس جگوں کی نسبت حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش پر خاصہ بین الاقوامی ہجوم تھا۔ خاص طور پر مشرقی یورپ کے زائرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ زائرین میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں، بوڑھے اور بوڑھیاں۔ سب اپنے بہترین لباسوں میں ملبوس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کی زیارت کے لئے دنیا کے دور دراز علاقوں سے آئے تھے۔

بلڈنگ کے سامنے گاڑی کے لئے پارکنگ کے لئے بالکل کوئی جگہ نہیں تھی۔ عزیز نے اگلے چوک پر گاڑی دائیں ہاتھ لی تو وہاں سے ایک گاڑی نکل رہی تھی۔ اُس نے فوراً گاڑی وہاں پارک کر دی۔

گاڑی لبِ سڑک کھڑی کر کے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اُس بلڈنگ تک آئے جس کے بارے میں عزیز نے کہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔

ایک چھوٹے سے درہ نما دروازے سے بلڈنگ کے اندر داخل ہوئے تو اندر بھی ہجوم تھا۔ ایک درمیانے سائز کے ہال میں زیر زمین ایک سٹرکچر تھا۔ کیا تھا وہاں کچھ لکھا نہیں تھا۔ لیکن اُس کی خستہ حالی اور سالخوردگی اُس کی قدامت کا پتہ دے رہی تھی۔ ہال کے اندر سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک چرچ جیسا چھوٹا سا اسٹیج بنا تھا جس کے نیچے ایک چھوٹی سی غار تھی جس میں ایک چھوٹی سی محرابی جگہ تھی جہاں بمشکل ایک وقت میں چند انسان کھڑے ہو سکتے تھے۔ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش تھی۔ لوگ ایک طرف سے داخل ہو کر، چند لمحے وہاں رکتے، پھر اپنے طریقے سے اظہارِ عقیدت کر کے سامنے بنی سیڑھیوں سے چڑھ کر واپس اُسی ہال میں پہنچ جاتے تھے جہاں سے اُس غار نما جگہ میں داخل ہوتے تھے۔ وہاں سے اُسی درہ نما دروازے سے باہر نکل کر بلڈنگ سے باہر نکل جاتے تھے۔

میں نے حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش پر کھڑے ہو کر درود پڑھا۔ دعا مانگی اور باہر چلا آیا۔ تب تک بھوک سے واقعتاً بُرا حال ہو رہا تھا۔ آنکھ میں آیا خون ابھی تک میری قوتِ دید میں حائل ہو رہا تھا۔ ابھی تک آنکھ صاف ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں انرجی لیول کا بھی بُرا حال تھا۔

حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش کی زیارت کر کے میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترتا عزیز کے ساتھ گاڑی تک پہنچا۔ اُس نے برف میں لگے ٹھنڈے پانی کی بوتل پیش کی۔ گاڑی کا ائیر کنڈیشن آن کیا۔ ٹھنڈے پانی اور ائیر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا سے جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر میں ابوشنب پہنچ کر کھانا آرڈر کیا۔ لیکن ریستوران والوں نے بھوک افزا کھانے اتنے زیادہ رکھ دیے کہ اُنہی سے پیٹ بھر گیا۔ پھر بھی ہم نے جو آرڈر کیا تھا کچھ کھایا۔ کچھ لنچ باکس میں پیک کروایا، ریستوران کا بل ادا کیا۔ گاڑی میں بیٹھے اور یروشلم کی طرف چل پڑے۔

میں نے عزیز سے کہا "اِس سے پہلے کہ بیت الحم یا یروشلم میں ہماری زیارت بن جائے، سیدھے ہوٹل چلو۔ اب راستے میں کہیں نہیں رکنا۔"

اُس نے بھی کہا مانا اور آدھے گھنٹے میں ہم مسجد اقصیٰ کے سامنے سے اپنے ہوٹل والی سڑک پر مڑ رہے تھے۔ جی بہت چاہا کہ چند لمحے وہاں رُک جائیں۔ مسجد کے اندر جائیں۔ اُس چٹان کو دیکھیں جہاں سے رسولِ پاک نے آسمانوں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اتنے تھکے بدن کے ساتھ۔ دل نے مسجد کے اندر جانے کی گواہی نہ دی۔ اِس لئے میں نے مسجد کے اندر جانے اور گنبد صخرا کی اندر سے زیارت اگلی صبح تک موقوف کی۔

اتنے میں گاڑی نے سڑک کا موڑ مڑا تو وہاں ایک دیوار پر چھوٹا سا ایک بورڈ چسپاں تھا جس پر عربی میں لکھا تھا: صَلِ قبلَ اَن یُصلیِ علیکَ۔ بورڈ پڑھ کر طبعیت مکدر ہو گئی۔ مجھے پاکستان میں سڑکوں پر لکھے بورڈ یاد آئے جن پر اُردو میں یہی بات لکھی ہوتی ہے کہ "نماز پڑھو اِس سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے۔"

میں نے کہا یہ کیسی سوچ کے لوگ ہیں جو ہر وقت انسانوں کو موت کے خوف میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ کاش اِن لوگوں کو زندگی میں خوشی کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔ کاش اِنہیں کبھی زندگی کے چہرے پر پھیلے نور کی چمک دیکھنا بھی نصیب ہو۔ کاش اِنہیں اندازہ ہو کہ خوش و خرم انسان بھی اللہ سے اِتنی ہی

محبت کر سکتا ہے جتنی یہ ہر وقت رونے دھونے کی دعوت دینے اور موت کی باتیں کرنے والے کرتے ہیں۔

گاڑی ہوٹل کے سامنے رُکی تو میں نے عزیز کو مقررہ معاوضہ ادا کر کے اُسے اگلی صبح ہوٹل لوٹنے کے لیے کہا۔ ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا تو لابی میں حاجی موسیٰ سے ملاقات ہو گئی۔ پچپن ساٹھ برس کا سرخ و سفید شفیق، مہرباں اور مسکراتے ہوئے چہرے والا حاجی موسیٰ اِس محبت اور تپاک سے ملا کہ دن بھر کی ساری تھکن ایک منٹ میں اتر گئی۔ اُس نے فوراً ایک ملازم کو ریستوران سے دو کپ چائے لانے کا کہا۔

ہم دیر تک ہوٹل کی لابی میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ حاجی موسیٰ نے اُس شام مجھے یروشلم کی تاریخ اور یروشلم میں واقع تاریخی مقامات کے بارے میں اتنی باتیں بتائیں، اتنی معلومات فراہم کیں، اسرائیل کے اندر مسلمانوں کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ تعلقات پر اتنا مواد فراہم کیا کہ اگر میں اسرائیل میں ایک دن اور بغیر گھومے پھرے واپس چلا جاتا تو یہ انفارمیشن میرے لئے کافی ہوتی۔

لیکن مجھے ابھی اسرائیل آئے دو دن ہوئے تھے۔ ابھی مجھے اِس ملک میں اور بہت کچھ دیکھنا تھا۔ اِس میں زندگی کے سارے رنگوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔ حاجی موسیٰ سے اور بہت سی کہانیاں سننا تھیں۔ وہ کہانیاں جو کسی کتاب میں تحریر نہیں ہوئیں۔ ایسی کہانیاں جو صرف دل میں تڑپ اور محبت رکھنے والے دو دل ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش۔ اندر کھڑے لوگ دعا کر رہے ہیں

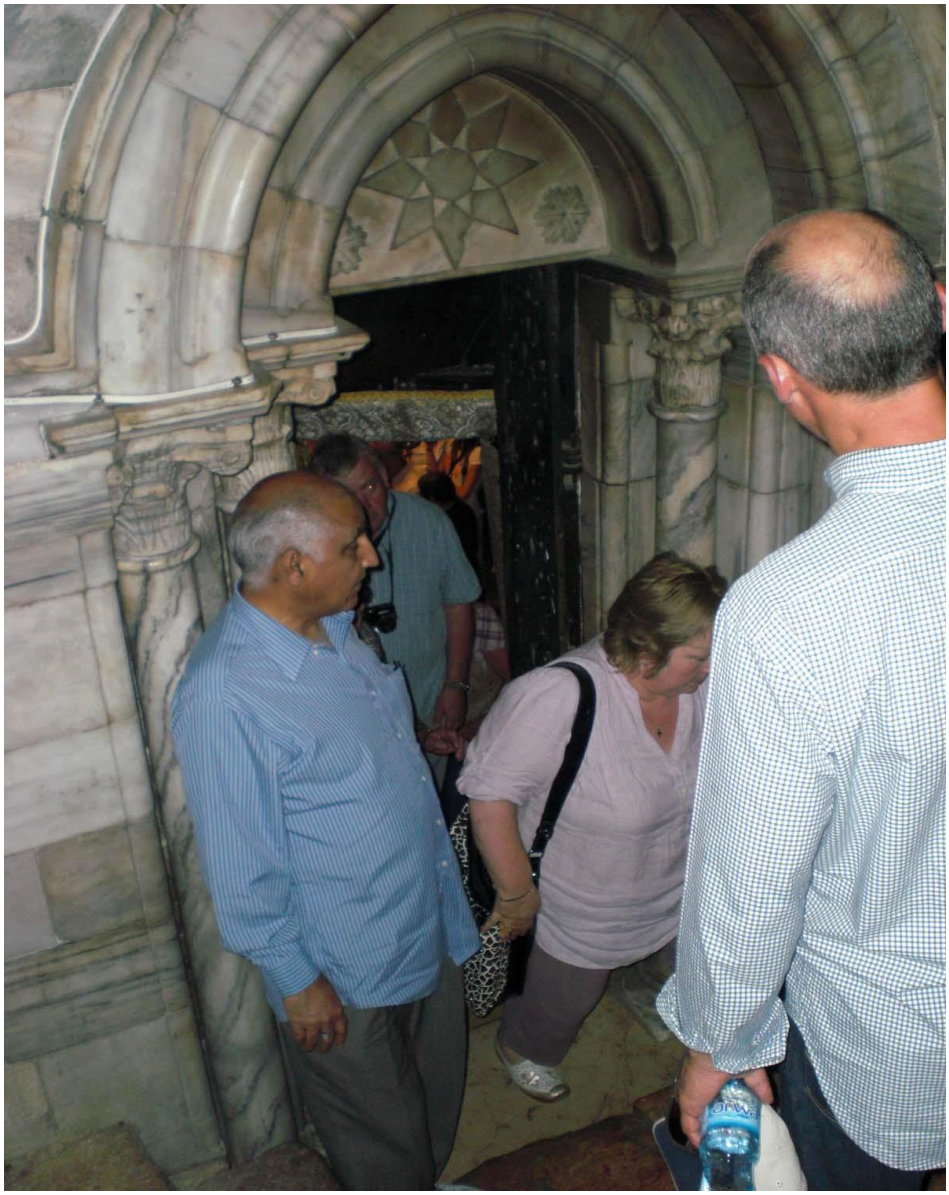

مصنف بیت الحم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش پر

اسرائیل میں تیسرا دن

مجھے یروشلم پہنچے دو دن ہو چکے تھے اور میں مسجدِ اقصیٰ اور گنبد صخرا سے چند قدم دور ہونے کے باوجود ابھی تک مسجد اور گنبد صخرا میں حاضری نہیں دے پایا تھا۔

رات حاجی موسیٰ سے گپ شپ کے بعد میں جلد ہی سو گیا تھا۔ اِس لئے صبح جلدی اُٹھ گیا۔ اچھی نیند کی وجہ سے میں ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ میرے جسم کا انرجی لیول بہت بہتر حالت میں تھا۔ میں نے تیزی سے اُٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کئے اُوپر جا کر ہوٹل کے ریستوران میں ناشتہ کیا اور تیزی سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دس منٹ چلنے کے بعد میں مسجد کے بہت سے دروازوں میں سے ایک کے سامنے تھا۔ یہ دروازہ غیر مسلموں کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن مسلمان کسی بھی دروازے سے مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہاں میں نے اپنی اسلامی شناخت سے فائدہ اُٹھایا اور دوسرے دروازے تک پیدل چلنے کی بجائے اِسی دروازے سے مسجد کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ پرانے یروشلم میں مسجدِ اقصیٰ ہی سب سے بڑا اسٹرکچر ہے۔

مجھے اِس کے رقبہ کا صحیح اندازہ نہیں۔ لیکن مسجد کے احاطہ میں کسی بھی دروازے سے داخل ہوں تو محسوس ہوتا ہے کسی بہت بڑے پارک میں داخل ہو رہے ہیں۔

سارے احاطہ میں زیتوں اور کئی اور طرح کے پودے اُگے ہیں۔ صرف مسجد کے اصل صحن میں کوئی درخت نہیں۔ مسجد کے اصل صحن سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر عین مسجد کے سامنے سنہری رنگ کا گنبد صخرا ہے جسے انگریزی میں ڈوم آف دی راک کہا جاتا ہے۔

میں نے گنبد صخرا کی زیارت سے پہلے مسجد کے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔

بد قسمتی سے دن چڑھے جب میں وہاں پہنچا تھا مسجد کے دروازے بند تھے۔ یہاں مسجد سے میری مراد ہے وہ ہال جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ لیکن دروازے بند ہونے کے باوجود مسجد میں کافی لوگ تھے۔ بہت سے فلسطینی وہاں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ مسجد کا احاطہ فلسطینیوں کے لئے پاکستانیوں کے دارے کا کام بھی دیتا ہے۔ وہ فارغ وقت میں وہاں آکر گروپوں کی شکل میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ نماز کے وقت جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی مسجد کی زیارت کے لئے آنے والے زائرین کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔

بہر حال مسجد کے دروازے بند دیکھ کر مایوسی سے میں گنبدِ صخرا کی جانب جانا ہی چاہتا تھا کہ مجھے مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں والکی ٹاکی پکڑے ایک شخص دکھائی دیا۔ وہ شکل سے فلسطینی اور مسلمان لگتا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتا تھا۔ میں نے اُس سے اپنا مسئلہ بیان کیا تو کہنے لگا مسجد کے اندر نئے قالین بچھائے جا رہے ہیں اس لئے دروازے بند ہیں۔ لیکن میں کوشش کرتا ہوں اگر وہ تمہیں اندر جانے دیں۔

یہ کہہ کر اُس نے والکی ٹالکی پر کسی سے بات کی۔ ایک دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک فلسطینی نے سر نکالا۔ میں جلدی سے لپک کر اُس کے پاس پہنچا اور مسجد کے اندر جانے کے اجازت مانگی۔ اُس نے کہا۔ مسجد کے اندر کام ہو رہا ہے اِس لئے اندر جانا ممکن نہیں۔ میں نے اُس سے استفسار کیا کہ وہ کون ہے۔ اُس نے کہا وہ مسجد کا متولی ہے۔

میں نے جیب سے پچاس شیکل کا نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا "ٹھیک ہے اگر اندر جانے کی اجازت نہیں تو نہ سہی لیکن وہ میری طرف سے مسجد کے لئے پچاس شیکل کا ہدیہ قبول کر لے تو عنایت ہو گی۔"

اُس نے اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے نہ صرف دروازہ کھول دیا بلکہ مجھے مسجد کے محراب کے پاس لے گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مسجد کا یہ حصہ کئی سال پہلے جلا دیا گیا تھا۔ اُردن کے شاہ حسین نے اِس کی نئے سرے سے تعمیر و تزئین کرائی تھی۔

محراب کے پاس ہی بائیں جانب ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی سے باہر تھوڑی دور ایک پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "جانتے ہو وہ کونسا پہاڑ ہے۔" میں نے کہا "نہیں میں نہیں جانتا۔" کہنے لگا "وہ جبل المکبرّ ہے۔" میں نے کہا "اِس پہاڑ کے نام جبل المکبرّ کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔" کہنے لگا "حضرت عمر اپنے ساتھی کے ساتھ اِسی راستے سے یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ جب پہاڑ سے انہیں مسجدِ اقصیٰ دکھائی دی تو اُنہوں نے بآوازِ بلند اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا بلند کی۔ جس سے اِس پہاڑ کا نام جبل المکبرّ پڑا۔" پھر اُس نے مسجدِ اقصیٰ کے اندر ہی بائیں طرف بنے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور کہنے لگا "یہ مسجدِ عمر ہے۔ یہاں پر حضرت عمر نے نماز ادا کی تھی۔" میں نے اُس سے اجازت لے کر پہلے مسجد اقصیٰ کے محراب کے پاس کھڑے ہو کر دو نفل ادا کئے اور اُس کے بعد مسجدِ عمر میں دو نفل ادا کئے۔

اُس نے مجھے ٹوٹی پھوٹی معرّب انگریزی میں کئی اور کہانیاں سنائیں لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ میں نے مسجد کے اندر داخل ہونے کی اجازت دینے کے لئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ پھر اُس نے مجھ بڑے تپاک سے خدا حافظ کہا اور میرے پیچھے مسجد کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

مسجد سے نکلا تو سامنے ہی گنبدِ صخرا تھا۔ مسجد کے احاطہ میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف فلسطینیوں کو سلام کہتا گنبدِ صخرا میں داخل ہوا تو دروازے میں کُرسی پر بیٹھے ایک فلسطینی نے روک لیا۔ عربی میں بولا "کہاں سے ہو۔" میں نے کہا "میں یو ایس اے سے آیا ہوں۔" کہنے لگا "چونکہ تم نے مجھے سلام نہیں کیا۔ اِس لئے میں سمجھا تم مسلمان نہیں ہو۔" میں نے کہا "میں نے تمہیں سلام کہا تھا لیکن تمہاری توجہ کسی اور طرف تھی۔ اِس لئے تم نے نہ میرا اسلام سنا نہ میرے سلام کا جواب دیا۔" اُس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ انتہائی محبت اور گرم جوشی سے سلام کہا اور گنبدِ صخرا کے اندر جانے دیا۔

گنبدِ صخرا کے اندر بہت سے مرد اور خواتین تھیں۔ لیکن خواتین کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ گنبدِ صخرا میں بیٹھے لوگوں میں سے کوئی قران پڑھ رہا تھا۔ کوئی نوافل ادا کر رہا تھا اور کوئی یونہی وہاں بیٹھا تھا۔

گنبدِ صخرا کے عین اندر اسکیفل لگے تھے۔ لگتا تھا۔ گنبد کے اندر ہر وقت ٹیپ ٹاپ چلتی رہتی ہے۔ لیکن اُس وقت وہاں کوئی کام نہیں کر رہا تھا۔ گنبد کے اندر واقع چٹان کے نیچے چند سیڑھیاں بنی تھیں۔ سیڑھیاں اُترا تو اُس کے نیچے پندرہ بیس آدمیوں کی جگہ تھی۔ وہاں بھی چند مرد اور خواتین نفل پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں نے بھی دو نفل ادا کئے۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی اور سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ اُوپر آ گیا۔

چٹان کے بارے میں روایت ہے کہ رسولِ پاک نے بھی یہاں نوافل ادا کئے تھے اور پھر یہیں سے معراج کے لئے آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے تھے۔ کہتے ہیں جب براق نے آسمان کی طرف اُٹھنا شروع کیا تو ساتھ ہی یہ چٹان بھی اُٹھنا شروع ہو گئی۔ رسولِ پاک نے اِس چٹان سے کہا کہ رُک جا تو وہ رُک گئی۔

اِس چٹان کو جالی کے اندر محفوظ کیا گیا تھا۔ جس فلسطینی نے مجھے یہ کہانی سنائی اُس نے کہا لوگ اِس چٹان کو ہاتھ لگا کر دعائیں مانگتے اور تصویریں اُتر واتے ہیں۔

میرا کیمرہ بھی میری جیب میں تھا۔ میں نے جالی میں اِس مقصد کے لئے رکھے گئے سوراخ میں سے ہاتھ اُس چٹان پر رکھا اور اُس فلسطینی سے استدعا کی کہ وہ میری تصویر بنا دے۔ اُس نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے کیمرہ پکڑا اور میری تصویر بنائی۔

اِس طرح اسرائیل میں اپنی آمد کے تیسرے دن میں مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرا کی اندر سے زیارت کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔ باہر سے تو اُن کا منظر روز و شب میرے ہوٹل کی کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ اِسی وجہ سے میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرا کی بہت سی تصاویر بھی اُتاری تھیں۔

گنبدِ صخرا کی زیارت کر کے باہر آیا تو دن پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوٹل پہنچا تو عزیز پہلے سے وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی اُس دن کے سفر کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ اپنے

کمرے میں واپس جانے کی بجائے عزیز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم نئے دن میں اسرائیل کے کچھ اور گوشے دریافت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

مسجد اقصیٰ کے صحن اور سامنے کا منظر

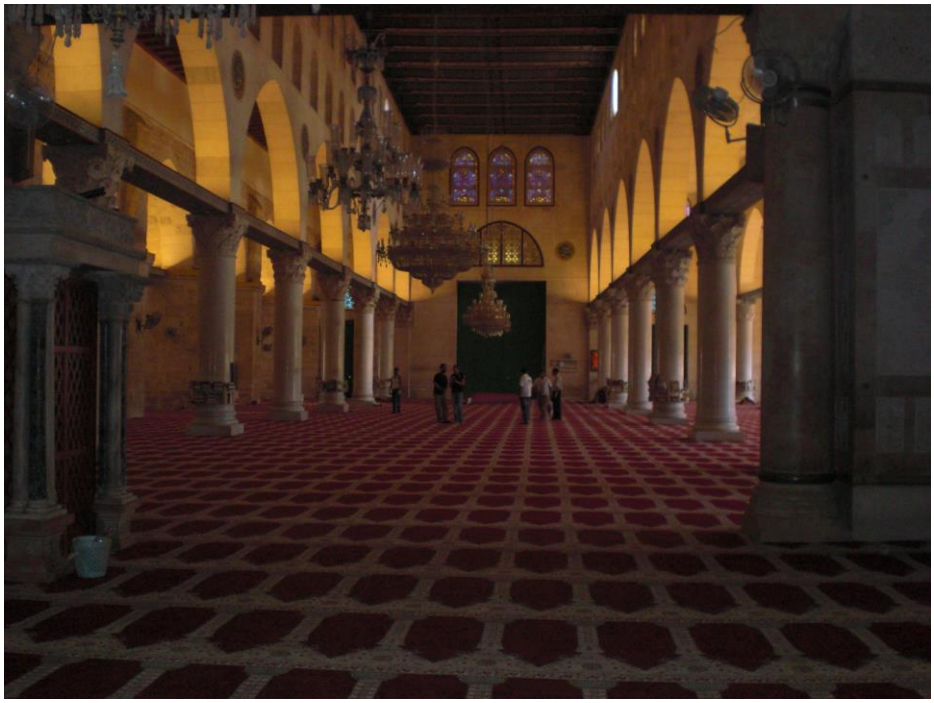

مسجد اقصیٰ کا اندرونی منظر

ڈوم آف دی راک

ڈوم آف دی راک کے اندر لگے سکیفلز

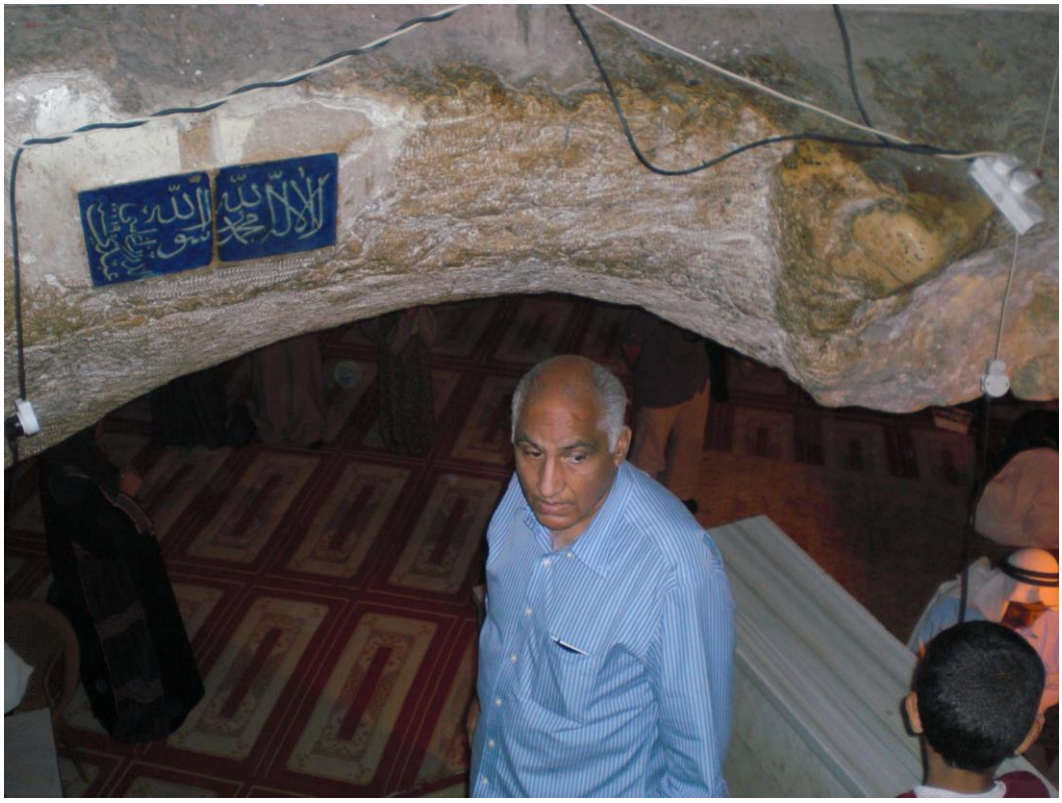

ڈوم آف دی راک کے نیچے اندر اترنے کا راستہ

ڈوم آف دی راک کے اندر خواتین نوافل پڑھ رہی ہیں

2

جیسے ہی گاڑی یروشلم کی حدود سے باہر نکلی دودھیا رنگ کے مٹی کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ راستہ یقیناً حیبران کے راستے سے مختلف تھا۔ میں نے گزشتہ دن عزیز سے بحر مردار دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا ہم آج کہاں جا رہے ہیں؟

اُس نے حسبِ معمول مسکراتے ہوئے کہا" نئے دن کا نیا سرپرائز"۔ میں نے کہا" پھر بھی مجھے اندازہ ہونا چاہئے کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں۔"

اس نے کہا" مسجد اقصیٰ تو آپ خود ہو آئے ہو۔ آج ہم پہلے نبی موسیٰ علیہ السلام جائیں گے۔ اُس کے بعد بحرِ مُردار جائیں گے۔ بحرِ مُردار جاتے ہوئے جہاں سے اسکرول ملے تھے وہاں جائیں گے اور اگر کچھ وقت بچ رہا تو پھر نبی صالح علیہ السلام جائیں گے۔"

بحرِ مُردار کو انگریزی میں ڈیڈ سی اور عربی میں بحر المیت کہتے ہیں۔ یروشلم سے نکلنے کے بعد جیسے جیسے ہم بحرِ مُردار کی طرف بڑھے سڑک پر اُس کے سائن دکھائی دینے لگے۔ حسب معمول سائن تینوں زبانوں میں تھے۔ انگریزی، عبرانی اور عربی میں۔

عزیز سے نبی موسیٰ علیہ السلام کا ذکر سن کر میں نے کہا" جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کبھی فلسطین میں داخل ہوئے تھے۔ اگر وہ فلسطین نہیں آئے تو پھر اُن کا روضہ یہاں کہاں سے آ گیا؟"

عزیز میرا سوال سُن کر پہلے تھوڑا پریشان ہوا پھر کہنے لگا" یہ مقامِ نبی موسیٰ علیہ السلام ہے۔" مقامِ موسیٰ علیہ السلام کی اصطلاح میرے لئے نئی تھی۔ اس لئے یہ اصطلاح سُن کر میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ میں نے کہا" اگر مقامِ نبی موسیٰ علیہ السلام بحرِ مُردار کے راستے میں پڑتا ہے تو پھر ٹھیک ہے ورنہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔"

گزشتہ چند روز سے میں اسرائیل کا جو لینڈ اسکیپ دیکھ رہا تھا اِس راستے کا لینڈ اسکیپ اُس سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ پہاڑ دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے مٹی کو کمپریس کر کے بنائے گئے ہوں۔ کیونکہ وہاں بھی فری وے بنانے کے لئے جس طرح ان کی کٹائی کی گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پہاڑ مٹی سے ضرور بنے ہیں لیکن یہ مٹی پتھروں سے کم سخت نہیں تھی۔ اِس مٹی میں چونے کی سفیدی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

بحرِ مُردار کے طرف جاتے اُس وقت ہم جس علاقے میں ڈرائیو کر رہے تھے وہاں گرمی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عزیز کی گاڑی کا ائیر کنڈیشنر بھی کچھ واجبی سا کام کر رہا تھا۔ گاڑی کی کھڑکیاں بند کرنے سے گاڑی میں حبس بڑھ جاتا تھا اور کھڑکیاں کھولنے سے ہوا آتی تھی لیکن ہوا خلاف توقع سردی مائل نہیں بلکہ گرمی مائل تھی۔ لیکن تھوڑا آگے بڑھے تو سڑک پر بحرِ مُردار کا سائن اور سطحِ سمندر سے اُس کی نچائی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہاں موسم کا یہ عجیب و غریب پیٹرن کیسے بن رہا تھا۔ بحرِ مُردار کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ زمین کا نچلا ترین غیر رہائیشی مقام ہے۔ بحرِ مُردار کے راستے پر تھوڑا آگے بڑھے تو سڑک پر واقعتاً نبی موسیٰ علیہ الاسلام کا سائن دکھائی دیا۔ میں سر بگریباں تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خیر عزیز نے سڑک پر لگے نبی موسیٰ کے سائن کی پیروی کرتے ہوئے گاڑی اُس طرف موڑلی جس طرف فری وے پر لگا سائن راہنمائی کر رہا تھا۔

فری وے سے نکلتے ہی لق ودق پہاڑی سلسلے میں دور ایک مسجد نما عمارت دکھائی دی۔ اُس عمارت کے آگے پیچھے دور دور تک کسی زندہ یا زندگی نما چیز کا نشان نہیں تھا۔

ہم فری وے سے نکلنے کے بعد تقریباً پانچ سات منٹ تک گاڑی چلا کر مقامِ موسیٰ علیہ السلام تک پہنچے تو یہ ایک انتہائی پُرانے انداز کی عمارت تھی۔ عمارت کے باہر چار پانچ دیہاتی فلسطینی بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ عزیز اور میں نے اُنہیں سلام کہا تو اُنہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے وعلیکم السلام کہہ کر ہمارے سلام کا جواب دیا۔

ہم اُن سے مزید کچھ کہے بغیر عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بنی تھی جس کے ساتھ ایک ملحقہ کمرے میں ایک قبر تھی۔

مسجد سے قران کی تلاوت کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے مسجد کے ملحقہ کمرے کی جالیوؤں میں سے اندر جھانکا تو قبر پر سبز رنگ کا غلاف چڑھایا گیا تھا جس پر سنہرے حروف میں قران کی آیت لکھی تھی۔ اتنی دیر میں مسجد سے تلاوت کی آواز آنا بند ہو گئی اور ایک پنتیس چالیس برس کا فلسطینی باہر آیا۔ ہم نے اُسے اسلام و علیکم کہا تو اُس نے وعلیکم السلام کہہ کر ہمارے سلام کا جواب دیا۔ پھر عربی میں مجھے کہنے لگا "کیا آپ کو عربی آتی ہے۔" میں نے کہا "بہت کم"۔ اس نے عزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے یہ دوست ہمارے درمیان ترجمان کے فرائض سر انجام دے گا۔"

پھر اُس نے کہا کہ وہ صرف میرے لئے روضے کا دروازہ کھولے گا۔ اتنا کہہ کر اُس نے روضے کا تالا کھولا۔ میں روضے میں داخل ہوا اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی۔ عزیز نے میری تصویر بنائی۔ چند لمحوں کے لئے قران میں حضرت موسیٰ کے حوالے سے سارے واقعات فلیش بیک کی طرح میرے ذہن میں نمایاں ہوئے اور پھر غایب ہو گئے۔ میں سوچوں میں ڈوب گیا۔

کہاں اپنے زمانے کے حاکمِ مُطلق فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چیلنج اور کہاں یہ بے برگ و گیاہ جلتے ہوئے خشک پہاڑی سلسلے میں اُن کا روضہ؟ میں دعا سے فارغ ہوا تو روضے کے متولی نے مجھے اُس روضے کی کہانی سنانی شروع کی۔

وہ کہانی عربی میں سنا رہا تھا۔ کچھ کہانی مجھے براہِ راست سمجھ آ رہی تھی۔ کچھ عزیز میرے لئے ترجمہ کر رہا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ رسول پاک جب معراج کی شب مسجد اقصیٰ تشریف لائے تھے تو سب انبیا حاضر تھے لیکن نبی موسیٰ علیہ السلام غایب تھے۔ رسول پاک نے بلند آواز سے کہا کہ اے موسیٰ میں سب انبیا کو دیکھ رہا ہوں لیکن آپ کہاں ہو۔ نبی موسیٰ علیہ السلام نے یہاں سے جواب دیا تھا کہ میں یہاں ہوں۔ تب سے یہاں نبی موسیٰ علیہ السلام کا روضہ بنایا گیا ہے اور اِس جگہ کو مقامِ موسیٰ علیہ السلام کہا جاتا ہے۔

یہ کہہ کر اُس نے وہاں چندے کے لئے رکھے ڈبے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میں اُس میں کچھ ہدیہ ڈال دوں۔ میں نے جیب سے بیس شیکل کا نوٹ نکال کر اُسے دینا چاہا۔ لیکن اُس نے پھر اشارے سے کہا نہیں نوٹ اُس ڈبے میں ڈالیں۔ میں نے انگریزی میں کہا ڈبے کی چابی بھی تو آپ کے پاس ہے۔ عزیز نے میرے جملے کا ترجمہ کرنے سے گریز کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بیس شیکل ڈبے میں ڈالے اور ہم مقامِ موسیٰ علیہ السلام سے باہر نکل آئے۔ اُس عرب نے دوبارہ مسجد میں بیٹھ کر قران کی تلاوت شروع کر دی۔

عمارت کے باہر بیٹھے دیہاتی فلسطینی اپنی جگہ سے اُٹھ کر عمارت کے دروازے کے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے لیکن ہم اُن کی طرف توجہ دیئے بغیر گرمی میں جھلستی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے بحرِ مُردار کی طرف روانہ ہو گئے۔

مقام موسیٰ علیہ السلام کی طرف جانے والی سڑک کا منظر

یہ پہاڑیاں خالص مٹی اور چونے کی بنی ہیں

وہ عمارت جس میں مقام موسیٰ علیہ السلام واقع ہے

یہ مقام موسیٰ علیہ السلام پر بنا اُن کا روضہ ہے

مقام موسیٰ علیہ السلام کا متولی مصنف کو مقام موسیٰ علیہ السلام کی کہانی سنا رہا ہے

3

ہمارا سفر دوبارہ بحرِ مُردار کی طرف جاری تھا۔ میں ڈیڈ سی کے بارے میں ایک عرصہ سے پڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اب اسرائیل آئے ہیں تو ڈیڈ سی دیکھ کر جائیں۔ پڑھنا کبھی دیکھنے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے گزشتہ روز عزیز سے کہا تھا کہ وہ مجھے بحرِ مُردار ضرور لے جائے۔ وہ بات اُس کے ذہن میں تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ بحرِ مُردار کے جس علاقے سے ڈیڈ سی اسکرول ملے تھے میں وہ علاقہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔

مقامِ موسیٰ علیہ السلام سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا ہدف یہی دو علاقے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ اگر یہاں سے ٹائم بچا تو ہمیں جیریکو جائیں گے۔ میں نے عزیز سے پوچھا کہ قریب کونسا علاقہ ہے؟ ڈیڈ سی یا ڈیڈ سی اسکرول۔؟ اُس نے کہا ڈیڈ سی اسکرول کا علاقہ بحرِ مُردار سے پہلے آتا ہے۔ اسرائیلی حکومت نے وہاں ایک پارک سا بنا دیا ہے۔ جہاں ڈیڈ سی اسکرول کے بارے میں ایک ڈاکیومینٹری فلم دکھائی جاتی ہے ۔ فلم کا ٹائٹل ہے سیکریٹس آف کمران۔

عزیز ٹورسٹ گائیڈ نہیں تھا۔ وہ فقط ایک گاڑی ڈرائیور تھا۔ جو سیاحوں کو اُن جگہوں پر لے جاتا تھا جہاں وہ جانا چاہتے تھے۔ اُسے یروشلم اور یروشلم کے گردونواح میں تقریباً ہر اہم تاریخی جگہ کا پتہ تھا۔ لیکن اُس کا تاریخ کا علم بہت محدود تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نہ ہونے کے برابر تھا تو زیادہ مناسب ہو گا۔

اُس نے چند ہوٹلوں سے روابط بڑھا رکھے تھے۔ ہوٹل والے اُسے باقاعدگی کے ساتھ ائیر پورٹ سے پیسنجر اُٹھانے اور چھوڑنے کے لئے اور اپنے مہمانوں کو یروشلم اور یروشلم کے گردونواح میں واقع تاریخی مقامات کی زیارتوں کے لئے استعمال کرتے رہتے تھے۔ عربی اُس کی مادری زبان تھی۔ انگریزی اور عبرانی اُس نے اسکول میں پڑھی تھیں۔ وہ تینوں زبانوں میں رواں تھا اور اچھا خاصہ کام چلا لیتا تھا لیکن تاریخی مقامات کے بارے میں اُس کے علم میں زیادہ گہرائی نہیں تھی۔ اِس لئے بعض اوقات اُس کے

لئے سوالوں کے جوابات صحت اور یقین کے ساتھ دینا مشکل ہوتا۔ لیکن اگر آپ نے ریسرچ کر رکھی ہو اور آپ کو کسی واقعہ کی تفصیلات از خود معلوم ہوں تو آپ اس کی خدمات سے یقناً استفادہ کر سکتے ہیں۔

علمی سطحیت کے باوجود اُس میں ایک بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت قابلِ اعتماد اور بھروسے کا آدمی تھا۔ زبان کا پکا اور قول کا سچا۔ آپ کے ساتھ ہے تو پھر آپ کے ساتھ ہے۔ آپ اُسے جہاں اور جس وقت بلائیں گے وہاں پانچ منٹ پہلے پہنچے گا دیر سے نہیں۔

چند دن اُس کے ساتھ گزارنے کے بعد میری طبعیت بھی اُس کے ساتھ مل گئی تھی۔ اُس کی معیت میں اسرائیل کو جاننے کا سفر بہت اچھی طرح طے ہو رہا تھا۔

ہم مقامِ نبی موسیٰ علیہ السلام سے نکل کر تقریباً آدھ گھنٹے میں ڈیڈ سی اسکرول کی سائٹ پر پہنچ گئے۔ اسرائیلی محکمہ تحفظات تاریخی مقامات نے اُس جگہ جو پارک بنایا تھا وہاں یہودیوں کے بہت سے گروہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے تاریخی ورثے سے بہت محبت ہے۔ جس احتیاط اور محویت سے وہ اُس پارک میں رکھی چیزیں دیکھ رہے تھے اُس سے اُن کے شعور کی پختگی اور اپنے تاریخی ورثے کو اگلی نسلوں تک اصل حالت میں منتقل کرنے کی تمنا اور خواہش کا پتہ چلتا تھا۔

محکمہ تحفظات تاریخی مقامات نے پارک میں ایک چھوٹا سا تھیٹر بنا دیا تھا۔ تھیٹر میں پچاس ساٹھ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ جہاں سیاح داخل اور خارج ہوتے رہے ہیں اور ہر وقت سیکرٹس آف کمران فلم مسلسل چلتی رہتی تھی۔ اِس پندرہ منٹ کی ڈاکیومینٹری میں دکھایا گیا تھا کہ ابتدائی زمانے میں یہودیوں کی اجتماعی سماجی زندگی کیسی تھی۔ اُن کے شب و روز کیسے گزرتے تھے اور وہ کس طرح اپنے مقدس مسودات کے تحفظ کا جتن کرتے تھے۔ اِسی غرض سے ڈیڈ سی اسکرول بھی غیر آباد پہاڑیوں میں چھپائے گئے تھے۔ ڈاکیومینٹری میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ کس طرح اِن پہاڑیوں میں روز بکریاں چرانے والے چرواہے کو اِن تک رسائی حاصل ہوئی تھی۔

پارک میں داخلے کے ٹکٹ کی قیمت اڑتالیس شیکل تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اسرائیل میں ایسے زیادہ تر مقامات پر داخلے کے لئے ٹکٹ اڑتالیس شیکل ہی تھی۔ اڑتالیس کا ہندسہ کہاں سے آیا تھا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ پچاس شیکل پندرہ امریکی ڈالروں کے برابر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے تمام مقامات میں داخلے کے ٹکٹ کی قیمت چودہ یا پندرہ ڈالر تھی۔

میں نے اپنے اور عزیز کے لئے دو ٹکٹ خریدے اور ہم تھیٹر میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھیٹر میں تقریباً پچاس ساٹھ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہمارے تھیٹر میں داخل ہوتے ہی پچیس تیس سیاحوں کا ایک گروہ بھی تھیٹر میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ سب شکل وصورت اور اپنے طور طریقوں سے یہودی دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے اُن کے ہمراہ بیٹھ کر ساری ڈاکیومینٹری دیکھی۔ اُن کے روایئے اور تاثرات میں عقیدت کا رنگ نمایاں تھا اور وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ عبرانی بول رہے تھے۔ شاید سب اسرائیلی یہودی تھے۔

ہم ڈیڈ سی اسکرول کے بارے میں دی سیکرٹس آف کمران ڈاکیومینٹری دیکھ کر نکلے اور بغیر رُکے گاڑی میں سوار ہو کر بحرِ مُردار کی طرف چل پڑے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ ہم بحرِ مُردار پر پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ گزار کر جیراکو جائیں گے اور پھر لنچ وہیں پر کریں گے۔ کیونکہ عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ جیراکو میں ایک بہت اچھا ریستوران ہے جہاں خوراک مزے دار اور ماحول بہت اچھا ہے۔ اگرچہ جیراکو بھی یہودیوں اور فلسطینیوں کی لڑائی میں ایک اہم شہر ہے اور اس حوالے سے اکثر بین الاقوامی خبروں میں رہتا ہے لیکن جیراکو کے گرد کوئی سکیورٹی وال نہیں بنائی گئی وہاں بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت ہے لیکن شہر میں داخل ہونے سے پہلے اسرائیلیوں کا ایک سکیورٹی چیک پوائنٹ ہے جہاں شہر میں آنے والوں کا ایک نظر جائزہ لیا جاتا ہے۔

لیکن جیراکو کی وجہ شہرت وہاں ہزاروں سال پرانے جیراکو کا محفوظ کیا گیا ایک حصہ ہے جسے دنیا کا قدیم ترین شہر سمجھا جاتا ہے۔

جیراکو کا شہر اگرچہ فلیٹ لینڈ پر آباد ہے لیکن اس کا ہزاروں سال پرانا حصہ مٹی کی انہی دودھیا پہاڑیوں کے سلسلے میں واقع ہے۔ دنیا کے اس قدیم ترین شہر میں جانے کے لئے ایک ٹرین بنائی گئی ہے جس پر سوار ہو کر لوگ آج کے جیراکو سے قدیم جیراکو تک کا سفر کرتے ہیں۔

بحرِ مُردار کے ارد گرد لینڈ اسکیپ کچھ ایسا ہے کہ کسی بھی جگہ سے اُس تک رسائی ممکن نہیں۔ صرف چند مخصوص مقامات سے اُس تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہاں پر بیچ ایریاز ڈیویلپ کئے گئے ہیں۔ انہی ایریاز میں سے ایک کالیہ بیچ ہے۔ کالیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی جن پر اللہ تعالیٰ نے لواطت کی وجہ سے عذاب نازل کیا تھا۔ پتہ نہیں ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی عذابِ الٰہی کا فضا میں ابھی اثر باقی ہے یا ویسے ہی اب بھی اِس علاقے میں ایک وحشت برستی محسوس ہوتی ہے۔

ہم ڈیڈ سی اسکرول والے پارک سے جلد ہی کالیہ بیچ پہنچ گئے۔ عام سمندری بیچوں کے برعکس کالیہ بیچ پر ہوا کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ عین بیچ پر اور سمندر کے اندر بھی ہوا بالکل ناپید تھی۔ پانی بالکل ساکت تھا۔ پانی میں کسی قسم کی کوئی ہل جل یا لہریں نہیں تھیں۔ سمندر کا پانی بھی بالکل ٹھنڈا نہیں تھا۔ ماحول میں بھی سخت گرمی تھی۔ یہاں بھی بیچ پر داخلے کے لئے اڑتالیس شیکل ٹکٹ مقرر تھا۔

میں نے پھر دو ٹکٹ خریدے اور دس پندرہ فٹ کی ڈھلان پر بنے راستے پر چلتے ہوئے بیچ پر پہنچ گئے۔ بیچ پر بہت سے یہودی خاندان اور جوڑے ممکنہ طور پر مختصر ترین لباسوں میں ملبوس بیچ پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر دھوپ میں اپنا رنگ کالا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ پانی کے اندر لیٹے تھے۔ کچھ بیچ کے ساتھ بیٹھے بیچ سے مٹی نکال کر اپنے جسموں پر مل رہے تھے۔ کچھ خشک شدہ مٹی کو سمندر کے پانی سے دھو رہے تھے۔ اِس کی وجہ شاید بحرِ مردار کے پانی میں پائے جانے والے نمکیات ہیں جو کئی جِلدی بیماریوں کے لئے اکسیر ہیں۔

اِس کے علاوہ چونکہ بحر مردار زمین پر نیچا ترین غیر رہائشی مقام ہے یہاں سورج کی مضرِ صحت شعاؤں کے اثرات کی شدت میں کمی آجاتی ہے جس سے ایسے جلدی امراض کے صحتیاب ہونے میں مدد ملتی ہے جو ان مُضِر شعاؤں کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔

بحر مُردار کا پانی نمکیات کی وجہ سے اس قدر بھاری ہو چکا ہے نہ اس میں کشتی رانی ہو سکتی ہے۔ نہ سمندری اسپورٹس کھیلی جا سکتی ہیں۔ نہ اِس میں کسی قسم کی زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ سمندر کے پانی میں کمی آتی جا رہی ہے۔ اور پانی کی سطح نیچے سے نیچے ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے اِس کے بیچ بھی وقت کے ساتھ نیچے سے نیچے ہوتے جا رہے ہیں۔ بحر مُردار کے ایک طرف اسرائیل ہے۔ جبکہ دوسری طرف کی پہاڑیاں اُردن کی سرزمین کا حصہ ہیں۔ بحر مُردار میں پانی بھی دریائے اردن سے آتا ہے۔

جدید دور کی زرعی سہولیات کی وجہ سے اب دریائے اُردن کا کافی پانی اُردن میں زرعی ضروریات کی تکمیل میں استعمال ہو جاتا ہے اِس لئے بحر مُردار میں پانی کی آمد اور بھی کم ہو گئی ہے۔

پانی میں داخل ہونے کے بارے میں بیچ پر جگہ جگہ عبرانی، عربی اور انگریزی میں ہدایات لکھی ہیں کہ پانی کے اندر غوطہ نہ لگایا جائے۔ کس صورت میں پانی منہ کے اندر نہ جانے دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو فورا بیچ پر واقع فرسٹ ایڈ کے کارندوں سے رابطہ کیا جائے۔

کیونکہ ہم نے نیکر نہیں پہنے تھے۔ اس لئے میں اور عزیز پینٹس اوپر چڑھا کر پانی کے اندر چلے گئے۔ پانی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ پیروں کی طرف خون کی گردش بڑھ گئی ہے۔ ہم کوئی پندرہ بیس منٹ پانی میں کھڑے رہے اس کے بعد باہر نکل آئے۔ بیچ پر جگہ جگہ تازہ پانی کے شاور لگِائے گئے تھے تاکہ لوگ سمندر سے نہا کر نکلیں تو تازہ پانی سے اپنے وجود پر لگے نمکیات کو صاف کر سکیں۔

چونکہ سمندر میں مچھلیاں یا اور کوئی حشرات نہیں پائے جاتے اِس لئے بحر مردار کی سطح پر پرندے بھی نہیں اُترتے۔ اسرائیلی ساحل سے لیکر دوسری طرف اُردن کی پہاڑیوں تک سمندر میں کوئی پرندہ دکھائی نہیں دیتا۔ بحر مُردار واقعتاً بحر مُردار ہے۔

عزیز اور میں نے ساحل پر لگے شاور سے اپنی ٹانگوں پر تازہ پانی ڈالا۔ اپنے اپنے جوتے پہنے اور آہستہ آہستہ چلتے واپس بیچ کے داخلے کے مقام پر آئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا مستقل اسٹال بنایا گیا ہے جہاں سے لوگ سوڈا اور کھانے پینے کا سامان خرید سکتے ہیں۔

ہم نے بھی دس دس شیکل میں لیمونیڈ کے دو گیلاس خریدے اور مسافروں کے بیٹھنے کے لئے قناتیں لگا کر بنائی گئی جگہ پر بیٹھ گئے۔ پنکھوں سے پھینکی جانے والی ٹھنڈی، پانی سے بھیگی، ہوا نے عجیب خوشگوار کیفیت پیدا کر دی۔ ہم نے پنکھوں سے آنے والی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھ کر لیمونیڈ ختم کیا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بجا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ لنچ ہم جیراکو میں جا کر کریں گے۔ اس لئے ہم جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے جیراکو کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتے تھے تاکہ جیراکو میں گھومنے پھرنے کے علاوہ ہم عزیز کے مجوزہ ریستوراں میں لنچ کریں اور پھر وقت پر واپس یروشلم پہنچ سکیں۔

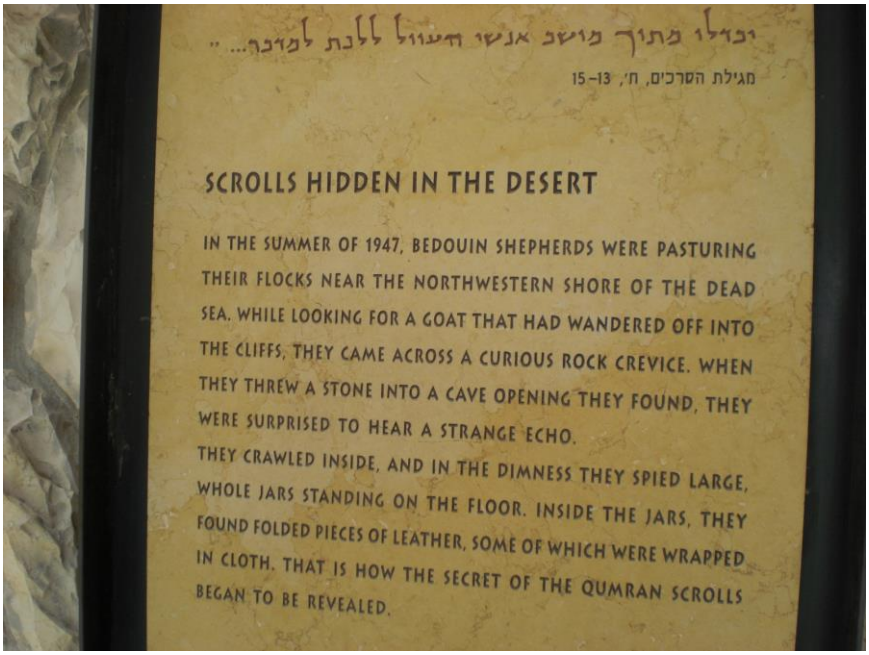

بحر مردار کے پاس ملنے والے اسکرول کی مقام پر نصب تختی

جہاں اسکرول ملے تھے اُس جگہ بنا پارک اور تھیٹر

تھیٹر میں ہر وقت "سیکریٹس آف کمران" نامی ڈاکیومینٹری فلم چلتی رہتی ہے

بحر مردار کا ایک منظر۔ پس منظر میں اُردن کی طرف واقع پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں

بحر مردار کا ایک منظر

4

جیسے ہی ہم جیرا کو کی حدود میں داخل ہوئے وہاں سکیورٹی پوسٹ پر اسرائیلی سکیورٹی والے موجود تھے۔ اُنہوں نے ایک لمحہ گاڑی روکی، گاڑی کے اندر جھانکا، عزیز سے میرے بارے میں سوال کیا اور پھر ہمیں جانے دیا۔

سکیورٹی سے گزرنے کے فوراً بعد جیرا کو کی حدود میں سڑک کے دائیں ہاتھ پر ایک کئی منزلہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل تھا۔ ہوٹل کی پیشانی پر لکھا تھا "انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کاسینو"۔

میں نے عزیز سے پوچھا کیا اِس ہوٹل میں کاسینو ہے۔ اُس نے کہا ہاں اِس ہوٹل میں کاسینو ہے اور یہاں دور دور سے لوگ جوا کھیلنے کے لئے آتے ہیں۔

اس پہاڑی سلسلے میں جیرا کو فلیٹ لینڈ پر واقع ہے۔ شہر پر نئی ڈیولپمنٹ کا گمان ہوتا ہے۔ سڑکیں کشادہ ہیں ۔گھروں کی تعمیر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئے بنائے گئے ہیں۔ میں شہر کی نئی وضع قطع دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ جیرا کو کو دنیا کا قدیم ترین شہر کیوں کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو اچھا بھلا جدید شہر ہے۔

ہم کافی دیر جیرا کو کے اندر گاڑی چلاتے رہے۔ سیکورٹی سے کافی آگے جا کر شہر کی جامع مسجد دکھائی دی۔ ہم مسجد کے پاس رُکے بغیر آگے چلتے رہے۔

مقامی فلسطینوں میں یک حکائیت مشہور ہے کہ حضور پاک جب معراج پر تشریف لے جا رہے تھے۔ براق پر پرواز کے دوران اُن کا ایک جوتا جیرا کو کے اوپر گر گیا تھا۔ وہ جوتا جیرا کو والوں نے اُٹھا کر جیرا کو کی مسجد میں رکھوا دیا تھا۔ اب وہ جوتا جیرا کو کی مسجد میں موجود ہے۔

میں نے اِس حکائیت کی تصدیق یا تردید کی ضرورت محسوس نہ کی۔ نہ میں مسجد میں گیا اور یہ چیک کرنے کی کوشش کی کہ وہاں واقعتاً حضور کا جوتا موجود ہے یا نہیں۔ اور نہ کسی دوسرے شخص سے اِس کے بارے میں پوچھا۔

اسی طرح کی ایک روایت میں نے مسجدِ اقصیٰ میں مغربی دیوار کے بارے میں بھی سُنی تھی۔ روایت کے مطابق حضور جب مسجد اقصیٰ تشریف لائے تھے اُنہوں نے اپنا براق اُس دیوار کے ساتھ باندھا تھا۔ اِس نسبت سے اُس دیوار کو دیوارِ براق بھی کہا جاتا ہے۔

بہر حال جیراکو میں گاڑے چلاتے ہوئے ایک جگہ سڑک کے بالکل پاس ہی کھجوروں کے چند درخت تھے۔ عزیز نے چند لمحوں کے لئے کھجور کے درختوں کے پاس گاڑی روکی تو کھجوروں والے نے جلدی سے گاڑی کے پاس آکر ہمیں کچھ کالے اور کچھ زرد رنگ کی کچی کھجوریں دیں۔

کھجوریں خاصی میٹھی تھیں لیکن ہمارا کھجوریں خریدنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خاص طور پر میرے لئے تو کھجوریں زہر قاتل تھیں۔ اِس لئے خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کھجوریں خریدنے کے بارے میں ہمارا غیر سنجیدہ رویہ دیکھ کر کھجوریں بیچنے والے نے عربی میں کچھ ریمارکس پاس کئے جنہیں میں سمجھنے سے قاصر رہا۔ تاہم ریمارکس سننے کے بعد عزیز نے وہاں سے گاڑی فوراً آگے بڑھادی۔

دیکھنے میں جیراکو اگرچہ نیا دکھائی دے رہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیراکو دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ قدیم ترین ہونے کے علاوہ اسے زمین پر نیچا ترین رہائشی مقام ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جیراکو کی تاریخ کوئی گیارہ ہزار سال تک جاتی ہے۔ گیارہ ہزار سال میں جیراکو کئی بار اُجڑا اور آباد ہوا۔ اِس اُجڑنے اور آباد ہونے کے عمل میں یہ کئی تہذیبی مراکز کا حصہ رہا۔ کبھی یہ سلطنت ایران کا حصہ بنا، کبھی سلطنت یونان اور کبھی سلطنت روما کا۔ کبھی سلطنت عثمانیہ کا اور کبھی برطانیہ کا۔

کہتے ہیں کہ مصر سے فرار ہونے والے یہودی غلام بھی اکثر جیراکو میں آکر قیام پذیر ہوتے تھے جس کی وجہ سے یہودیت کبھی جیراکو کی ثقافت کا حصہ رہی ہے۔ اِس وقت بھی جیراکو میں پانچ سو سے ہزار کے قریب یہودی آباد ہیں۔

جیراکو جانے والی سڑک پر نصب ہر بورڈ پر اس کا نام عبرانی، عربی اور انگریزی میں لکھا تھا۔ انگریزی میں اس کا نام جیراکو، عربی میں اریحا اور عبرانی میں یاریحو لکھا تھا۔ اریحا کا عربی زبان میں مطلب ہوتا ہے

خوشبو۔ جبکہ عبرانی میں یاریحو لفظ یارتح سے نکلا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے چاند۔ کہتے ہیں پرانے زمانے میں جیراکو کے رہنے والے چاند کی پرستش کرتے تھے اِس لئے اِس کو یاریحو کہتے ہیں۔ یہ بات قرین قیاس بھی ہے۔ قران میں حضرت ابراہیم کے فکری ارتقا میں چاند اور سورج کی پرستش کا ذکر ہے۔

جیراکو شہر میں گاڑی چلاتے ہم شہر کے اُس حصے میں پہنچے جہاں سے دنیا کے قدیم ترین جیراکو تک پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ٹرین جاتی ہے۔

موسم میں سخت گرمی ہونے کی وجہ سے میں نے جیراکو کے کھنڈرات تک جانے سے گریز کیا۔ ویسے بھی دن کے دو ڈھائی بج چکے تھے اور بھوک خوب چمک اُٹھی تھی۔ اِس لئے میں نے فی الحال لنچ کھانے کو ترجیح دی اور قدیم کھنڈرات تک جانے کا فیصلہ لنچ کے بعد تک موقوف کر دیا۔

ریستوران میں داخل ہوئے تو اُس کا ماحول عزیز کے بیان سے بڑھ کر خوش گوار پایا۔ ریستوران کا نام ٹیمپٹیشن ریستوران ہے۔ یہ ریستوران ایک فلسطینی عرب کی ملکیت ہے۔

ریستوران میں ڈیڑھ دو سو مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ بفے میں پچاسیوں ڈشیں تھیں۔ جو عرب اور مغربی ڈشوں کا امتزاج تھیں۔ ایک سے ایک مزیدار۔ ایک سے ایک بڑھیا۔ جن سے اٹھنے والی خوشبو کافی اشتہا انگیز تھی۔ عملہ بھی خاصہ متحرک اور قیمت بالکل مناسب۔ جتنا مرضی اور جو مرضی کھاؤ قیمت صرف پچاس شیکل یا پندرہ ڈالر۔ ادائیگی چاہے شیکلز میں کرو چاہے ڈالرز میں۔

لنچ کھاتے تین ساڑھے تین بج گئے۔ لنچ سے فارغ ہو کر نکلنے لگے تو ریستوران کا فلسطینی مالک دکھائی دیا۔ اُس کا نام ابو رعد تھا۔ عزیز اُسے جانتا تھا۔ اُس نے ابو رعد سے میرا تعارف کرایا۔

ابو رعد نے چائے کی آفر کی لیکن ہم پہلے ہی لنچ کے بعد چائے پی چکے تھے۔ اب مزید کچھ کھانے پینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے میں نے ابو رعد کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کے ریستوران کے ماحول، خوراک اور حسنِ انتظام کی تعریف کی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے وہاں آنے اور کھانا کھانے کے لئے شکریہ ادا کیا۔

فلسطینی پاکستانیوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ انہیں پاکستانیوں کی وہ سب عنایات یاد ہیں جو وقتاً فوقتاً پاکستان نے اُن کے کاز کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کی لئے کیں۔

ابو رعد کو افسوس تھا کہ میں نے لنچ کے لئے پیسے ادا کئے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں سو شیکلز واپس لوں لیکن میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا۔

میں نے چند دن پہلے عزیز کو عمرہ کی خاطر کئے گئے پہلے سفر سعودی عرب کا ایک واقعہ سُنایا تھا۔ ہوا یوں کہ مکہ میں ایک دوکان دار نے یہ دیکھ کر کہ میں پاکستانی ہوں بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ میں نے اُس کا نفرت آمیز رویہ دیکھ کر اُس سے کہا کہ میں پاکستانی دکھائی ضرور دیتا ہوں لیکن میں اب پاکستانی نہیں امریکی شہری ہوں اور اِس وقت امریکہ سے آیا ہوں۔ امریکہ کا نام سُنتے ہی اُس سعودی کا رویہ فوراً بدل گیا اور اُس نے کئی بار مجھے اہلاً وسہلاً یا اخی کہہ کر خوش آمدید کہا۔

عزیز نے اِس واقعہ کو بہت انجوائے کیا اور کئی مختلف ملنے والے فلسطینوں کو سُنایا۔ اُس نے یہ واقعہ ابو رعد کو بھی سُنایا۔ ابو رعد نے بھی اِس واقعہ سے خوب لطف اُٹھایا۔ پھر کہنے لگا لیکن میں نے جو محبت پیش کی ہے وہ ایک پاکستانی بھائی کے لئے ہے امریکی کے لئے نہیں۔

ابو رعد سے ہاتھ ملا کر ٹیمپٹیشن ریستوران سے باہر نکلے تو میں نے عزیز سے واپس یروشلم چلنے کے لئے کہا۔ میں جیرا کو کے کھنڈرات تک نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میرے کہنے پر عزیز نے گاڑی واپس یروشلم جانے والی سڑک پر ڈالی اور میں نے ستانے کے لئے سر سیٹ کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔

میری آنکھیں کھلیں تو ہم یروشلم کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے عزیز سے کہا۔ میں غزہ کی چیک پوسٹ تک جانا چاہتا ہوں تا کہ اُس دیوار کی تصویریں بنا سکوں جو غزہ اور اسرائیل کے درمیان بنائی گئی ہے۔ عزیز نے کہا ایسی دیواریں اسرائیل میں فلسطینی عربوں کی تمام آبادیوں کی گرد بنائی گئی ہیں۔

ایک دیوار تو یہیں یروشلم کے پاس ہی موجود ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے گاڑی ایک طرف موڑ لی۔ ہم پندرہ منٹ کے بعد یروشلم میں واقع ابوعدیس کے گرد بنی تیس فٹ اُونچی دیوار دیکھ رہے تھے جس کے اُوپر کانٹوں والے تار لگے تھے۔

عزیز نے کہا "یہ ابوعدیس ہے۔ یہ فلسطینی عربوں کی آبادی ہے۔ یہاں رہنے والے فلسطینی یروشلم میں صرف ایک چیک پوسٹ کے ذریعے داخل اور خارج ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا جیل خانہ ہے۔ جس میں عملی طور فلسطینی قید ہیں۔" میں نے دیوار کی چند تصویریں بنائیں۔ میں ابوعدیس کی دیوار کی تصاویر بنا رہا تھا تو میں نے دیکھا۔ عزیز کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی۔

میں دیوار کی تصویریں بنا چکا تو عزیز نے گاڑی واپس ہوٹل کی طرف موڑ لی۔ ہم تھوڑی دیر گاڑی چلانے کے بعد ہوٹل پہنچ گئے۔ عزیز نے اگلے دن کے بارے میں میرا پروگرام پوچھا۔

ابھی اسرائیل میں دیکھنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن میرے پاس زیادہ دن باقی نہیں تھے۔ لہذا میں نے عزیز سے کہا کہ اگلے دن کہیں اور جانے کی بجائے وہ دس بجے کے قریب مجھے نئے یروشلم میں اسرائیلی میوزیم کے سامنے اُتار دے اور تین بجے کے قریب وہاں سے اُٹھا لے۔ وہ ایسا ہی کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا اور میں ہوٹل میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اِس طرح اسرائیل میں میرا تیسرا دن تمام ہوا۔

جیراکو میں ایک کھجور فروش

جیراکو میں ٹیمپٹیشن ریستوران کا مالک ابو رعد

یروشلم میں فلسطینیوں کے علاقے ابوعدیس کو دیوار بنا کر باقی یروشلم سے کاٹا گیا ہے

یروشلم میں ابو عدیس کی دیوار کا ایک اور منظر

اسرائیل میں چوتھا دن

اگلے دن سو کر اُٹھا تو تقریباً صبح کے نو بج چکے تھے۔ میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو گنبد صخرا سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ گنبد سے ٹکرا کر لوٹنے والی کرنیں آنکھوں کو خیرا کر رہی تھیں۔

ہوٹل کی طرف سے ملنے والے مفت ناشتے کے انقطاع کا وقت نو بجے تھا۔ اِس لئے میں نے جلدی سے دانت صاف کئے، شیو کی، غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے اور چھٹے فلور پر واقع ریستوران میں چلا گیا۔

ریستوران کا چارج ایک فلسطینی عرب کے پاس تھا جس کا نام حبیب ہے۔ حبیب کو سوائے عربی کے کوئی زبان نہیں آتی۔ اُس نے صرف ضرورت کے لئے انگریزی کے دو تین جملے رٹ رکھے ہیں۔ جب وہ اپنے عربی لہجے میں وہ جملے ادا کرتا ہے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے مجھے ایک ٹیبل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور انڈوں کا آملیٹ، چند ڈبل روٹی کے توش، فروٹ کا کٹیل اور اورنج جیوس کا گیلاس میرے سامنے رکھ دیا۔

دن کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ میں ناشتہ کر کے نیچے اترا تو عزیز پہلے سے ہوٹل کی لابی میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں وقت ضائع کئے بغیر اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم یروشلم میں اسرائیلی میوزیم کی طرف روانہ ہو گئے۔ اُس وقت پُرانے اور نئے یروشلم کی سڑکوں پر ٹریفک کا رش خاصہ بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ ٹریفک سے بچتے بچاتے ساڑھے دس بجے اسرائیلی میوزیم پہنچ گیا۔

میں نے اُسے میوزیم کے گیٹ پر خدا حافظ کہتے ہوئے پانچ بجے واپس آنے کے لئے کہا۔ لیکن اُس کا خیال تھا میوزیم میں میرے لئے پانچ چھ گھنٹے گزارنا کافی مشکل ہو گا۔ اس لئے وہ تین بجے آجائے گا۔ میں نے چند لمحے اس کی تجویز پر غور کیا اور پھر اُسے تین بجے واپس لوٹنے کے لئے کہہ دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ

میوزیم میں چار گھنٹے کافی نہیں ہوں گے۔ اس لئے میں جلدی سے میوزیم کے اندر چلا گیا۔ کاؤنٹر پر جا کر اڑتالیس شیکلز کا ٹکٹ خریدا اور میوزیم کی پہلی گیلری میں داخل ہو گیا۔

اسرائیل میوزیم آف یروشلم کی بنیاد یروشلم کے میئر ٹیڈی کیلک کی کوششوں سے 1965 میں رکھی گئی۔ ٹیڈی کیلک کا خواب تھا کہ اسرائیل میوزیم آف یروشلم کو دنیا بھر میں ایک مثالی میوزیم بنایا جائے۔ میوزیم کے لئے اسرائیل کی پارلیمنٹ، سپریم کورٹ اور ہیبرو یونیورسٹی آف یروشلم کے پاس رکھی گئی۔ میوزیم کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ جولائی 2010 تک چلتا رہا۔

اس وقت میوزیم میں پانچ لاکھ سے زیادہ آئٹم ہیں جو افریقہ، مڈل ایسٹ، شرق بعید اور شمالی اور جنوبی امریکہ سے لائے گئے ہیں۔

ان میں سے کئی آئٹم بائیبل آرکیالوجی سے متعلق ہیں۔ کئی ایک کا براہِ راست یہودیت سے تعلق ہے۔ کئی ایک کا فنونِ لطیفہ سے تعلق ہے۔ کئی ایک انسانی ثقافت اور تہذیب کے ارتقا سے متعلق ہیں۔ کئی ایک زندگی اور موت کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حصے میں مختلف ادوار میں مُردوں کو دفنانے کے طریقے اور رسومات پر مبنی مواد شوکیسوں میں رکھا۔

یہودی چونکہ شروع سے مختلف وجوہات کی بنا پر دنیا بھر میں بکھرے رہے ہیں۔ اِس لئے اِس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں جہاں جہاں یہودی جن حالات میں زندگی کرتے رہے ہیں یا اب بھی کر رہے ہیں اُن کی میوزیم میں نمائندگی ہو۔ چنانچہ اِس مقصد کے لئے دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے یہودی مختلف ادوار میں جو لباس استعمال کرتے رہے ہیں۔ خواتین جس طرح کے زیورات استعمال کرتی رہی ہیں۔ اِن ملبوسات اور زیورات کے نمونے بھی میوزیم میں رکھے گئے ہیں۔ کئی ایک ممالک سے پورے کے پورے سناگاگز کے اندرونی حصے میوزیم میں منتقل کئے گئے ہیں۔ اِن حصوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مقامی کلچر مذہبی مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کس طرح مذہبی مظاہر مقامی کلچر میں اپنی روح قائم رکھتے ہوئے اپنے پیروکاروں کی روحانی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

اِس مقصد کے لئے سُرینام اور کوہ چین انڈیا سے لائے گئے سناگاگز خاص طور پر سیاحوں کی توجہ حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح اِن کو میوزیم میں سیٹ کیا گیا ہے آپ ان کے اندر داخل ہو کر محسوس کرتے ہیں کہ آپ اسرائیل میں نہیں واقعتاً اُن کلچرز میں یہودی کلچر کا تجربہ کر رہے ہیں۔

میوزیم میں امپریشنسٹ اور پوسٹ امپریشنسٹ آرٹ کے مظاہر بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ کئی تصاویر اتنی دلکش ہیں کہ آپ کا جی چاہتا ہے گھنٹوں کھڑے دیکھتے رہے۔

ایک تصویر جس نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ حضرت ابراہیم کی تصویر تھی جس میں اُنہوں نے دائیں ہاتھ میں چھری پکڑ رکھی ہے۔ بائیں ہاتھ سے اپنے نو عمر بیٹے کو سر کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔ بیٹے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ اُس کی گردن قربان گاہ پر رکھی ہے۔ جب کہ اُس کا بدن بائیں سمت پر فلور تک 45 ڈگری زاویئے پر لیٹا ہے۔ بیٹے کے بدن پر کوئی کپڑے نہیں۔ صرف شرم گاہ کے گرد ایک بہت ہی مختصر سی لنگوٹی لپٹی ہے۔ حضرت ابراہیم کو ایک ادھیڑ عمر، طویل القامت سفید فام مرد کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ جس کے سر کے بال اُڑ چکے ہیں۔ لیکن سر کے ارد گرد سیاہ بال موجود ہیں۔ بیٹا نوجوان سفید فام لڑکا ہے۔ جو دیکھنے مین چودہ پندرہ برس کا لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔ پاس ہی دائیں طرف، بالکل بیٹے کے قدموں کے پاس، ایک فرشتہ ایک دُنبہ لئے حضرت ابراہیم سے التماس کر رہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے بجائے اُس دنبے کی قربانی کریں۔

تصویر کے رنگ اس قدر زندگی سے بھرپور ہیں کہ لگتا ہے تصویر کے سارے کردار ابھی آپ سے ہم کلام ہوں گے -اُن میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حضرت ابراہیم اور اُن کے بیٹے کی تصویریں اِتنی دلکش ہیں کہ جی چاہتا ہے انسان انہیں دیکھتا رہے۔

میں نے تصویر کے دائیں طرف لکھا آرٹسٹ کا نام پڑھنا چاہا۔ لیکن بد قسمتی سے دائیں آنکھ کی بینائی ہنوز بند اور بائیں آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے میں عینک لگانے کے باوجود آرٹسٹ کا نام نہ پڑھ

سکا۔ میرے پاس کیمرہ موجود تھا۔ میں نے چاہا اُس تصویر کی تصویر بناؤں لیکن میوزیم حکام کی واضح ہدایات کی وجہ سے میں چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔

یہ تصویر کئی یورپی آرٹسٹوں نے اپنے اسٹائل کے مطابق بنائی ہے لیکن جو تصویر اسرائیل میوزم میں ہے اُس کا جواب نہیں۔

میوزیم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے میوزیم کے اسٹور میں میوزیم میں لگی تصویروں کے سب البم دیکھے تا کہ اگر کسی البم میں وہ کتاب موجود ہو تو وہ البم خرید لوں۔ لیکن بد قسمتی سے کسی البم میں وہ تصویر موجود نہیں تھی۔ جس سے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔

ابھی میں نے آدھا میوزیم ہی دیکھا تھا اور بہت سی گیلریاں ابھی باقی تھیں لیکن میری گھڑی پر پہلے ہی تین بج چکے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ عزیز باہر موجود ہو گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے میرا زیادہ دیر تک انتظار کرنا پڑے۔ چنانچہ میں مختلف گیلریوں سے ہوتا ہوا تیزی سے میوزیم سے باہر نکل آیا۔ عزیز واقعتاً سڑک کے کنارے گاڑی میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے اُسے کیمرہ دیا کہ وہ میوزیم اور اور کنیسیٹ کے پس منظر کے ساتھ میری تصویریں بنائے۔ وہاں گاڑی پارک کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس کے باوجود اُس نے تیزی سے گاڑی سے اُتر کر میری چند تصویریں بنائیں۔ اِس کے بعد ہم گاڑی میں بیٹھ کر میوزیم سے روانہ ہو گئے۔

میں نے اُس سے پوچھا اگر قریب میں کوئی اچھا ریستوران ہو تو ہوٹل جانے سے پہلے میں وہاں لنچ کرنا چاہوں گا۔ اُس نے کہا نئے اور پرانے یروشلم کے بارڈر پر ایک بہت اچھا ریستوران ہے۔ اُس کی خوراک اور ماحول بہت خوبصورت ہے۔ آپ کو ماحول بھی پسند آئے گا اور خوراک بھی۔

میوزیم سے نکلنے کے دس پندرہ منٹ بعد ہم ریستوران پہنچے۔ ریستوران کا ماحول واقعتاً اپنی مثال آپ تھا۔ ریستوران کے اونر فلسطینی تھے لیکن ریستوران کا نام پاشا تھا۔

میں اسرائیل میں جس ریستوران میں بھی گیا میں نے دیکھا ہر ریستوران میں زیادہ تر سبزیاں مختلف طریقوں سے تیار کر کے اپیٹائزر کے طور پر پیش کی گئیں۔ اس مقصد کے لئے یا تو اُنہیں پراسس کر کے پکلز میں تبدیل کیا گیا تھا یا گرِل یا تیل میں ہلکا فرائی کر کے اپیٹائزر بنایا گیا تھا۔

پاشا میں بھی گوبھی، بینگنوں اور توریوں کو پھانکوں کی صورت کاٹ کر تیل میں ہلکا براؤن کر کے اپیٹائزر بنایا گیا تھا۔ تمام سبزیوں کا اصل ذائقہ بھی محفوظ تھا اور ہلکا پکنے کی وجہ سے اُن کے فلیور میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ مجھے پاشا کے یہ اپیٹائزر بہت خوش ذائقہ لگے۔

ہم کھانا کھا کر پاشا سے نکلے تو شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ آج چونکہ زیادہ چلا پھرا نہیں تھا اِس لئے تھکن بالکل نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے اُس وقت کہیں اور جانا مناسب نہ سمجھا۔ اِس لئے ہم پاشا سے نکل کر سیدھے ہوٹل چلے آئے۔ ہوٹل پہنچا تو لابی میں ہوٹل کا فلسطینی مالک حاجی موسیٰ بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی ہوٹل کے ایک ملازم کو کہہ کر ہوٹل کے ریستوران سے چائے منگوائی۔ عزیز مجھے ہوٹل چھوڑ کر کل واپس لوٹنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں اور حاجی موسیٰ ڈنر تک ہوٹل کی لابی میں بیٹھے فلسطین کی تاریخ اور اسرائیل کے اندرونی حالات پر گفتگو کرتے رہے۔ اِس گفتگو کے دوران آج پھر موسیٰ نے یروشلم میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور اسرائیل کے اندرونی حالات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ پہلے میوزیم کی سیاحت اور پھر حاجی موسیٰ کی گفتگو میرے لئے اسرائیل کے بارے میں ایک نیا تعلیمی تجربہ تھا۔ حاجی موسیٰ کے ساتھ طویل نشست کے بعد میں نے چھٹے فلور پر جا کر ہوٹل کے ریستوران میں ڈنر کیا۔ پھر دوبارہ نیچے ہوٹل کی لابی میں آ کر کمپیوٹر پر اُس دن کے پاکستانی اور امریکی اخبارات دیکھے۔ وہی خبریں تھیں جو ہم روز پڑھتے اور سنتے ہیں۔ کوئی نئی بات دکھائی نہ دی۔ اِس لئے میں کمپیوٹر سے اُٹھا اور سونے کے لئے پانچویں فلور پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پارلیمنٹ کے بالکل مخالف سڑک سے پار اسرائیل میوزیم کی عمارت

نیویروشلم میں اسرائیل کی پارلیمنٹ کا منظر۔ اسرائیلی اسے کینیسٹ کہتے ہیں

اسرائیل میں پانچواں دن

میں سات دن کے لئے اسرائیل آیا تھا۔ لیکن عملی طور پر میرے پاس پانچ دن تھے۔ اتوار کے روز سان فرانسسکو سے روانہ ہو کر میں سوموار کے دن سرِ شام یروشلم پہنچا تھا۔ اِتنے مختصر عرصے میں جہاں جہاں جایا جا سکتا تھا گیا اور جو جو کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔ اسرائیل ایک چھوٹی سی ریاست ضرور ہے لیکن اُس میں دیکھنے کے لئے اتنا کچھ ہے کہ سب کچھ دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ کافی نہیں۔

خوش قسمتی سے میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا وہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں مسجدِ اقصیٰ، گنبد صخرا، ماؤنٹ آف آلیو، حضرت داؤد علیہ السلام کا روضہ، حضرت سلمان فارسی کی مسجد اور روضہ مبارک، دیوار گریہ جسے انگریزی میں ویسٹرن وال کہا جاتا ہے جو دراصل مسجدِ اقصیٰ ہی کی مغربی دیوار ہے بالکل ہوٹل کے قریب ہی واقع ہیں۔

میں سوموار کے دن تل ابیب کے بن گورین ائیر پورٹ پر اُترا ضرور تھا لیکن مجھے ابھی تک تل ابیب شہر میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے سفر کے اختتام سے قبل ایک دن تل ابیب میں بھی گزاروں۔ تل ابیب ہی دراصل وہ شہر ہے جہاں سے اسرائیل کی موجودہ ریاست کا آغاز ہوا تھا۔

یاد رہے میں نے اسرائیل کی موجودہ ریاست کا ذکر کیا ہے۔ یہودیت یا صہیونیت کا نہیں۔ یہودیت ایک باقاعدہ مذہب کے طور پر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن نسلی اعتبار سے حضرت موسیٰ سے بہت پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے بلکہ اُن کے زمانے سے بھی پہلے سے چلی آ رہی تھی۔

صہیونیت کا آغاز 1897 میں ہنگری کے جرنلسٹ تھیوڈور ہرزل کی کتاب ڈر جیوڈنسٹاٹ کی اشاعت سے ہوا۔ تھیوڈور ہرزل نے دنیا بھر میں پھیلے یہودیوں کو ترغیب دی کی وہ سلطنت عثمانیہ کے فلسطین میں ہجرت شروع کریں۔ تاکہ ہزاروں سالوں سے دربدر پھرتے یہودی اپنی ریاست قائم کر سکیں۔

تھیوڈر ہرزل کے آئیڈئے نے بہت تیزی کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلے یہودیوں کی توجہ حاصل کی اور بعض طاقت ور یہودیوں نے باقاعدہ فلسطین میں ہجرت کی تحریک شروع کر دی۔ اِسی تحریک نے آگے چل کر صہیونیت کی شکل اختیار کر لی۔ اِس تحریک کو یورپ اور روس میں یہودیوں کے خلاف عوام میں پھیلی نفرت نے اور طاقت دی۔ یورپ میں اشکنازی یہودیوں نے ایک طرف یورپی ممالک میں اپنے تحفظ کے لئے قوانین بنوائے اور دوسری طرف اسرائیل کے قیام کے لئے راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔

اِس پسِ منظر میں یورپی ممالک میں آباد یہودیوں نے فلسطین کے ساحلی شہر یافا میں اُنیسویں صدی کے اختتامی سالوں میں ہجرت شروع کی۔

یافا جسے جافا بھی کہا جاتا ہے فلسطین میں بحر روم کے ساحل پر واقع بندر گاہ ہے جس میں ہزار ہا سال سے صد فی صد عرب آباد تھے۔ شروع میں صہیونیت کی تحریک کے زیر اثر چند یہودی یافا میں آکر آباد ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ یافا میں ایک منصوبے کے تحت اُن کی تعداد بڑھنا شروع ہو گئی۔

1909 میں یہودیوں نے یافا کے ایک حصے میں باقاعدہ گھر بنانے شروع کئے۔ یہاں تک کہ اگلی چند دہائیوں میں یہودی تعداد میں پہلے یافا میں آباد عربوں کے برابر ہوئے اور پھر اُن کی تعداد عربوں سے تین چار گنا بڑھ گئی۔ اس طرح تل ابیب یافا کے پہلو میں ایک شہر کے طور پر قائم ہوا۔ 1948 میں تل ابیب کو بنیاد بنا کر باقاعدہ اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ یہودیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے یافا کے عربوں کے ساتھ اُن کے جھگڑے تو بہت پہلے شروع ہو گئے تھے لیکن اسرائیل کے قیام کے بعد یہ جھگڑا باقاعدہ فلسطین کی آزادی کی تحریک اور اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد میں تبدیل ہو گیا۔ جو اب تک جاری ہے۔

اسرائیل میں میں اپنے پانچویں دن صبح سو کر اُٹھا تو میں نے فیصلہ کیا کہ آج کا دن تل ابیب میں گزاروں گا۔ چنانچہ جیسے ہی عزیز ہوٹل پہنچا میں نے اُس سے کہا کہ وہ مجھے تل ابیب لے جائے۔

اُسے پتہ تھا کہ اگلے دن آدھی رات کے وقت مجھے یو ایس اے واپس جانے کے لئے ائیر پورٹ روانہ ہونا تھا اِس لئے اُس نے تل ابیب میں دن گزارنے کو میرا صحیح فیصلہ قرار دیا۔

ہم کوئی دس بجے کے قریب یروشلم سے تل ابیب کی طرف روانہ ہوئے۔ یروشلم سے باہر نکلتے ہی رام اللہ کی حدود شروع ہو گئیں۔

فری وے کے ساتھ ساتھ ایک دیوار بنائی گئی تھی جو رام اللہ کے شہریوں کی یروشلم میں آمد و رفت کو مسدود کرتی ہے۔ عزیز نے مجھے بتایا کہ پہلے رام اللہ کے شہری کئی راستوں سے چند کلو میٹرز کا سفر کر کے یروشلم میں کام کاج کے لئے داخل ہو سکتے تھے لیکن اب یہ دیوار بنا کر اُن کے یروشلم میں داخلے کے لئے صرف ایک پوسٹ بنا دی گئی تھی جس کی وجہ سے اُنہیں یروشلم آنے کے لئے تقریباً پنتیس کلو میٹر سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس پوسٹ کے علاوہ وہ کہیں سے یروشلم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ایک فلسطینی کے نقطہ نظر سے اُس کی بات ٹھیک تھی لیکن اسرائیلی نقطہ نظر سے جب سے اسرائیل نے فلسطینی بستیوں کے گرد اگرد یہ دیواریں کھڑی کی تھیں اسرائیل میں ہر طرح کے حملے رُک گئے تھے اور اب خال خال ہی ایسا کوئی واقع رونما ہوتا ہے۔

رام اللہ کے علاقے کے ساتھ ساتھ فری وے پر ہمارا سفر تل ابیب کی طرف جاری تھا۔ سڑک پر بہت سی گاڑیاں پوری رفتار کے ساتھ بھاگ رہیں تھیں۔ دن خاصہ گرم ہو چکا تھا۔ عزیز نے یروشلم سے نکلتے ہی پانی کی ٹھنڈی بوتلیں گاڑی میں رکھ لی تھیں۔ اسرائیل میں سفر کرتے ہوئے اگر ٹھنڈے پانی کی بوتلیں ساتھ رکھ لی جائیں تو تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد پانی پینے سے ایک طرف موسم کی وجہ سے لگنے والی پیاس بجھائی جا سکتی ہے تو دوسری طرف اُس سے گرمی میں بھی افاقہ محسوس ہوتا ہے۔

اسرائیل میں فری وے پر تقریباً تمام شہروں کے سفر کے درمیان فوجی چوکیاں بنی ہیں جہاں چاک وچوبند فوجی آنے جانے والی گاڑیوں اور گاڑیوں کے مسافروں کا ایک نظر ضرور جائزہ لیتے ہیں۔ زیادہ تر ایک نظر ڈال کر وہ گاڑی کو جانے دیتے ہیں لیکن بعض اوقت گاڑی روک کر مسافروں اور گاڑی کی تفصیلی چیکنگ بھی کرتے ہیں۔ ایسا اُس وقت اور بھی یقینی ہو جاتا ہے اگر گاڑی میں فلسطینی یا غیر یہودی سفر کر رہے ہوں۔

تل ابیب جاتے ہوئے سکیورٹی والوں نے ہماری گاڑی بھی روکی۔ عزیز کے کاغذات اور میرا پاسپورٹ دیکھا اور پھر ہمیں جانے دیا۔

ہم تل ابیب میں داخل ہوئے تو تقریباً دوپہر ہو چکی تھی۔ عزیز گاڑی پارک کر کے شہر میں پیدل چلنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے کہا کہ وہ گاڑی پارک نہ کرے تاکہ ہم کم سے کم وقت میں شہر کے زیادہ سے زیادہ حصوں کا جائزہ لے سکیں۔

یورپی شہروں کی طرح تل ابیب کا بھی ایک ڈاؤن ٹاؤن ہے جو یورپی انداز میں فلک بوس عمارتوں پر مشتمل ہے۔ تل ابیب میں کبھی مجھے سان فرانسسکو اور کبھی جدے کی مماثلت نظر آئی۔ عمارتوں کی تعمیر میں بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن میں یہودی فنِ تعمیر کی جھلک دکھائی دی۔ ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ بیسویں صدی کے آغاز میں جب یہودی یورپ سے تل ابیب منتقل ہونا شروع ہوئے تھے اُن میں زیادہ سے زیادہ جرمنی میں عمارتوں کے تعمیراتی کام سے وابستہ تھے۔ کئی سڑکیں اور سڑکوں پر بنائی گئی عمارتیں جدّت کا رنگ لئے ہوئے تھیں جب کہ کئی ایک میں قدامت جھلکتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم مڈل ایسٹ کے کسی پرانے شہر میں ڈرائیو کر رہے ہوں۔

امریکہ، یورپ اور دیگر بین الاقوامی شہروں کے برعکس تل ابیب میں مجھے کوئی میکڈانلڈ یا برگر کنگ دکھائی نہ دیا۔ اس بات پر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ میں نے سوچا شاید امریکہ کی کاروباری دنیا میں یہودیوں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اسرائیل کے شہروں میں میکڈانلڈ اور برگر کنگ کو ارادتاً

نہیں آنے دیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اسرائیل میں صرف ایک میکڈانلڈ بن گورین انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر دیکھا تھا اور شاید کسی اور شہر میں کہیں ایک آدھ اور دیکھا ہو۔ تل ابیب میں ڈرائیو کرتے ہوئے بھی کسی سڑک پر مجھے کہیں کوئی میکڈانلڈ دکھائی نہیں دیا۔ ہاں اگر شہر کے اندر کسی مال میں اس کی کوئی برانچ ہو تو کہہ نہیں سکتا۔

تل ابیب اتنا بڑا شہر نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تل ابیب کی آبادی کوئی آدھے ملین افراد پر مشتمل ہو گی۔ چنانچہ تل ابیب اتنا ہی بڑا ہے جتنا آدھے ملین کی آبادی کے شہر کو ہونا چاہئے۔

اسرائیل آنے سے پہلے بحر روم کے ساحل پر واقع تل ابیب کے بیچ کا بہت تذکرہ سنا تھا۔ میں نے عزیز سے کہا کہ وہ گاڑی کا رخ تل ابیب کے بیچ کی طرف موڑ لے۔

چنانچہ ہم شہر میں گھومنے پھرنے کے بعد تل ابیب کے بیچ کے طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد بیچ کے قریب پہنچے تو ہمیں ساحل کے ساتھ بنی سڑک کے ایک طرف بیچ اور ایک طرف تل ابیب کی جامعہ مسجد دکھائی دی۔ مسجد فنِ تعمیر کا بہترین شاہکار ہے۔ باہر اور اندر سے خوبصورت۔

ہم نے گاڑی مسجد کے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور سڑک عبور کر کے بیچ پر پہنچ گئے۔ اسرائیل میں یہ کام کرنے کا دن تھا۔ وہ پہر کا وقت تھا اور بیچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سارے بیچ پر جہاں تک نظر جاتی تھی دھوپ سے بچاؤ کی چھتریاں لگی تھیں جن کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔

کرسیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لوگوں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ خواتین تقریباً نیم برہنہ تھیں۔ زیادہ تر کے جسموں پر صرف مختصر انڈرویر اور چھاتیوں پر انتہائی مختصر براز تھیں۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ مرد صرف انڈرویئر یا نیکروں میں تھے۔

بیچ پر تقریباً ہر عمر کے لوگ تھے۔ بچے، جوان اور بوڑھے۔ چھوٹی بچیاں، جوان لڑکیاں اور معمر خواتین۔ بس ایک جلوہ روبرو تھا۔ ساحل پر آگ لگی تھی۔

تھوڑی دیر تلاش کے بعد ہمیں بھی ایک چھتری کے نیچے جگہ مل گئی۔ میں اور عزیز نے وہاں بیٹھ کر کوک کی بوتلیں پئیں اور وہاں سے اُٹھ گئے۔

میں نے عزیز سے کہا کہ بیچ پر سبھی لوگ یورپین یہودی یا اُن کی اولادیں ہیں۔ یہاں کوئی عرب فیملی دکھائی نہیں دی۔ عزیز نے کہا آپ کا مشاہدہ ٹھیک ہے۔ دراصل عربوں نے یہاں سے تھوڑا ہٹ کر الگ سے اپنا ایک بیچ بنا رکھا ہے اور وہ سب کے سب وہیں جاتے ہیں۔ اُن میں سے یہاں کوئی نہیں آتا۔

میں نے اُس سے پوچھا "کیا اُن کے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں ایسا نہیں ہے۔ لیکن یہودیوں اور عربوں میں جو ایک غیر مرئی دیوار کھڑی ہے اُس کی وجہ سے عرب یہاں آنے سے خود ہی حذر کرتے ہیں۔"

شہر میں گھومتے پھرتے اور اب بیچ پر بیٹھے ہمیں تقریباً ڈھائی بج چکے ہیں۔ لنچ کا وقت ہو چکا تھا اور بھوک بھی تل ابیب کے چمک دار دن کی طرح چمک رہی تھی۔

ہم تل ابیب کے بیچ سے اُٹھے اور شہر کے دوسرے حصے یافا کی طرف چل پڑے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے تل ابیب کو بیسویں صدی کے آغاز میں یہودیوں نے آباد کیا تھا لیکن تل ابیب سے پہلے یہاں اصل شہر یافا ہی تھا جو کہ ہزار ہا برس سے اِسی جگہ آباد چلا آ رہا ہے۔

پچھلی صدی میں یافا میں کھدائی سے ملنے والے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یافا ہزار ہا سال پہلے کانسی کے دور میں بھی اِسی جگہ آباد تھا۔

اگر یافا کی تاریخ پڑھیں تو فلسطین کے دیگر اہم شہروں کی طرح یافا بھی بندر گاہ ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ جنگی مہم جوؤں کی مہموں کا مرکز رہا ہے۔ یافا کے فاتحین کی فہرست دیکھیں تو اُس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا نام بھی دکھائی دیتا ہے۔

تل ابیب سے ہم یافا کے حصے میں داخل ہوئے تو وہاں ہمیں مین روڈ کے علاوہ شہر کی اندرونی سڑکوں پر بہت کم لوگ دکھائی دئے۔

ہم یافا میں عربوں والے بیچ پر پہنچے تو وہاں ہمیں بہت کم لوگ دکھائی دئے۔ مرد اور خواتین مکمل طور پر ملبوس تھے۔ کچھ مرد حضرات نیکروں میں دکھائی دئے لیکن خواتین نیکروں یا جانگیوں میں دکھائی نہ دیں۔ زیادہ تر اپنے مخصوص فلسطینی لباس میں ملبوس تھیں۔

وہیں بیچ پر ایک ریستوران تھا جس کا نام العجوز والبحر تھا۔ عزیز نے بتایا کہ یہ یافا کا مقبول ترین ریستوران ہے۔ بلکہ تل ابیب سے یہاں بہت سے لوگ لنچ اور ڈنر کے لئے آتے ہیں۔

ہم ریستوران میں داخل ہوئے تو وہاں کچھ فلسطینی عیسائی خواتین اور مرد لوگ لنچ کر رہے تھے۔ ان کی وضع قطع یہودیوں اور فلسطینیوں سے مختلف دکھائی دی تو میں نے عزیز سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اُس نے بتایا کہ یہ فلسطینی عیسائی ہیں۔

لنچ کے لئے میں نے چکن تکہ جبکہ عزیز نے فش آرڈر کی۔ لیکن روائیتی فلسطینی مہمان نوازی کے اصول کے مطابق ریستوران کے بیرے نے اکیس اپیٹائزرز لا کر ہمارے سامنے رکھ دئے۔ اپیٹائزرز سے تقریباً ہمارے پیٹ بھر گئے۔ جب تک آرڈر کی ہوئی خوراک آئی ہم پہلے سے فُل ہو چکے تھے۔

میں نے عزیز سے کہا اگر وہ چکن تکہ گھر لے جانا چاہے تو پیک کرا لے کیونکہ میں اپیٹائزرز سے پیٹ بھرنے کے بعد کچھ اور نہیں کھانا چاہتا تھا۔ عزیز کو میری تجویز اچھی لگی۔ اُس نے اپنا لنچ وہیں کھایا اور چکن تکہ باکس میں پیک کرا لیا۔ ہم لنچ سے فارغ ہوئے تو ساڑھے تین چار بج رہے تھے۔

اِس طرح تل ابیب اور یافا میں میرا دن تمام ہوا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ تل ابیب میں سیاحوں کی دلچسپی کے دیگر مقامات پر جاتا۔

یافا سے نکلتے ہوئے سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ لگتا تھا امریکی شہروں کی طرح یہاں بھی رش ہاور شروع ہو چکے تھے اور لوگ کام کاج کے بعد گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم یروشلم جانے والی فری وے پر تھے اور ہماری گاڑی یروشلم کی طرف فراٹے بھر رہی تھی۔

تل ابیب کے بیچ کا ایک منظر

تل ابیب میں واقع مسجد

حضرت سلمان فارسی کی قبر مبارک

حضرت سلمان فارسی کی مسجد کا اندرونی منظر

اسرائیل میں چھٹا دن

آج اسرائیل میں میرا آخری دن تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج صرف میں کسی اچھی جگہ لنچ کروں گا۔ ہو سکا تو آخری بار مسجدِ اقصیٰ اور گنبد صخرا کی زیارت کے لئے جاؤں گا۔ لیکن عزیز نے یہ کہہ کر میرا پلان تبدیل کر دیا کہ وہ حضرت سلمان فارسی کے مزار کے متولی سے مزار کی چابی لے کر آیا ہوں۔ جس دن ہم سلمان فارسی کے مزار پر گئے تھے دروازہ بند ہونے کی وجہ سے اندر نہیں جا سکے تھے۔

سلمان فارسی رسولِ پاک کے قریبی صحابیوں میں سے تھے۔ اُن کے مزار پر جانا ایک اعزاز تھا۔ چنانچہ میں فوراً اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

جیسے ہی ہم ہوٹل سے نکلے مجھے خیال آیا کہ ہم نہ تو ویسٹرن وال دیکھنے گئے ہیں نہ ہی ابھی تک صالح علیہ السلام کے مقبرے پر حاضری دی ہے۔

چنانچہ میں نے عزیز سے کہا کہ وہ پہلے سلمان فارسی کے مزار پر جائے، اُس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام کے مزار پر اُس کے بعد ویسٹرن وال پر۔

سلمان فارسی کا مزار ماونٹ آف آلیو سے تھوڑی دور واقع ہے۔ ان کا مزار مسجد کے اندر ہے۔ مسجد کو سلمان فارسی کی مسجد کہا جاتا ہے۔

عزیز نے مسجد کا دروازہ کھولا تو مسجد کے محراب کے دائیں طرف حضرت سلمان فارسی کی قبر مبارک تھی۔ میں نے قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا پڑھی اور اُس کے بعد کئی تصویریں بنوائیں۔ میرے ذہن میں اسلام کے ابتدائی زمانے کے کئی واقعات یاد آئے۔ خاص طور پر مجھے جنگ خندق کا واقعہ یاد آیا کہ کس طرح اُنہوں نے پیغمبرِ اسلام کو مدینے کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا اور کس طرح رسولِ پاک نے خندق کھودتے ہوئے پتھر سے نکلنے والی چنگاریاں دیکھ کر قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مسلمانوں کے زیر تسلط آنے کی پیشین گوئی کی تھی۔

حضرت سلمان فارسی کے مزار سے باہر نکلے تو میں نے عزیز سے کہا وہ ایک بار پھر ماونٹ آف آلیو لے چلے۔ ہم چند منٹ میں ماونٹ آف آلیو پہنچے تو اس کا گیٹ بند تھا۔ وہاں جا کر ہمیں پتہ چلا کہ آج سبت ہے اور سبت کے دن یہودی کوئی کام نہیں کرتے۔

لیکن سبت کا اصل سین ہم نے حضرت صالح علیہ السلام کے مقبرے اور اُن کے مقبرے سے نکلنے کے بعد دیکھا۔

ہوا یوں کہ جب ہم حضرت صالح علیہ السلام کے مزار پر پہنچے تو یہ مکمل طور پر خالی تھا۔ مزار کے اندر ایک چھوٹی سی لائبریری بنائی گئی تھی جس میں کتابیں رکھی تھیں۔ لائبریری کے نگران کے لئے ایک میز اور کرسی بھی رکھی تھی۔ لیکن میز کرسی پر بیٹھنے والا لائبریری کا نگران غائب تھا۔

عزیز نے بتایا عام طور پر یہاں ایک نگران ہوتا ہے لیکن آج سبت کی وجہ سے وہ غائب ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کے روضے کی عمارت باہر سے ایک پرانا قلعہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اندر داخل ہوں تو ایک ہال وے کے ساتھ ایک کمرے میں ان کی قبر مبارک اور ایک چھوٹی سی لائبریری اور دوسری طرف ایک طرف مسجد ہے۔ لگتا ہے کہ ہال وے مسجد کے ہال کو تقسیم کر کے بنایا گیا ہے۔ مسجد کی دیواریں، فلور اور محراب کی دیواریں کافی خستہ ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ طویل عرصہ سے اِس مسجد میں نہ کسی نے اذان دی ہے نہ نماز پڑھی ہے۔

میں نے حضرت صالح علیہ السلام کی قبر مبارک پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ پھر قبر مبارک کے ساتھ کھڑے ہو تصویریں بنوائیں۔

صالح علیہ السلام کے مقبرے سے باہر نکل کر واپس روانہ ہوئے تو رام اللہ اور پرانے یروشلم کے درمیان ایک علاقے میں سے گزر ہوا جس میں سو فیصد یہودی آباد ہیں۔ اس وقت وہ سناگاگ سے عبادت کے بعد اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ سب نے روائتی یہودی لباس پہنا ہوا تھا۔ عجیب سا کالا کوٹ اور سر پر ایک بڑا سا ہیٹ۔ ہیٹ دیکھنے میں ایک پتیلے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عزیز نے مجھے بتایا کہ یہ یہودیوں کا

روائتی لباس ہے جو سبت کے دن سناگاگ جاتے ہوئے پہنتے ہیں۔ وہ سب پیدل چل رہے تھے۔ یہودیوں میں سبت کے دن گاڑی چلانا بھی کام سمجھا جاتا ہے۔ لہذا سبت کے دن اُن کے لئے گاڑی کا استعمال بھی منع ہے۔ اِس لئے اُس علاقے میں اُس وقت سڑک پر تنہا ہماری گاڑی چل رہی تھی۔ جگہ جگہ یہودی ہمیں سبت کا احترام کرنے کے اشارے کر رہے تھے۔ کئی ایک نے بلند آواز سے کہا کہ آج سبت ہے اور تم گاڑی چلا رہے ہو۔

لیکن ہم جلد ہی اُن کے علاقے سے نکل کر مین روڈ پر آ گئے۔ مین روڈ پر اور بھی گاڑیاں موجود تھیں۔ لیکن گاڑیوں کی تعداد عام دنوں کی نسبت انتہائی کم تھی۔ وہاں بھی سبت کا اثر دکھائی دے رہا تھا۔

یہودیوں کے علاقے سے نکلنے کے بعد میں نے عزیز سے کہا کہ ہم دوبارہ پاشا جائیں گے اور آج پھر وہاں لنچ کریں گے۔ دو دن پہلے ہم پاشا گئے تھے تو اُس کے اپیٹائزرز مجھے بہت اچھے اور خوش ذائقہ لگے تھے۔

لنچ کے بعد میں نے عزیز کو یاد دلایا کہ ہوٹل جانے سے پہلے ہمیں دیوار گریہ بھی دیکھنی ہے۔ اُس نے کہا فلسطینی ہونے کی وجہ سے وہ اُسے اندر نہیں جانے دیں گے لیکن میں یو ایس سے آنے کی وجہ سے اندر جا سکتا ہوں۔ جب ہم دیوار گریہ پہنچے تو وہی ہوا۔ اسرائیلی فوجی وہاں کھڑے تھے۔ اُنہوں نے عزیز کو اندر جانے سے روک دیا لیکن میرا پاسپورٹ دیکھ کر مجھے اندر جانے دیا۔

میں نے سبت کی وجہ سے مذاق سے ایک اسرائیلی فوجی سے کہا میں اُس کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا آج سبت ہے اور آج تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ لیکن اگر میں کل آؤں تو وہ خوشی سے میرے ساتھ گروپ فوٹو بنوائیں گے۔ میں نے اُسے کہا آج اسرائیل میں میرا آخری دن ہے۔ میں کل صبح واپس یو ایس اے چلا جاؤں گا۔ اُنہوں نے اظہار تاسف کرتے ہوئے معذرت کی اور پھر کہا کہ اُنہیں افسوس ہے کہ سبت کی وجہ سے وہ تصویر کھنچوانے سے قاصر ہیں۔ اُن کا جواب سُن کر میں سوچ رہا تھا۔ کیا سبت تمہیں وردی پہننے اور بندوق پکڑنے سے نہیں روکتا؟ اگر ابھی کسی فلسطینی نے یہاں کوئی حرکت کی تو تم گولیاں چلانے سے بھی گریز نہیں کرو گے۔

خیر اُن کو مزید کچھ کہے بغیر میں دیوار گریہ کے احاطہ کے گیٹ سے گزر کر اندر پہنچا تو وہاں سبت کی وجہ اُس دن بہت سے یہودی دیوار کے پاس کھڑے ہل ہل کر تورات پڑھ رہے تھے اور کچھ دیوار میں اپنی دعاؤں کی پرچیاں اُڑس رہے تھے۔ احاطہ کے اندر جگہ جگہ لکھا تھا کہ سبت کی وجہ سے آج تصویر کشی منع ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ مہربانی کر کے تصویر کھینچ کر ہمارے جذبات مجروح نہ کریں۔

میں نے چند لمحے سوچا کہ تصویر کشی کروں یا نہ کروں۔ میں نے لوگوں کی نظریں بچا کر دیوار گریہ اور باقی عمارات کی تصاویر بنائیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں نے اُن عمارات کے سامنے کھڑا ہو کر تصویر بناؤں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے وہاں ایک یہودی نوجوان دکھائی دیا۔

میں نے اُسے اپنا کیمرہ تھماتے ہوئے کہا کہ وہ پہاڑی کے ساتھ بنی عمارت کے سامنے میری تصویر بنا دے۔ اُس نے ایک بار میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور پھر کیمرہ پکڑ کر تصویر بنا دی۔ پھر کہنے لگا کیا تم دیوار مقدس کے سامنے تصویر نہیں بنواؤ گے؟ میں نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں۔ پھر اُس نے دیوار گریہ کے سامنے میری چند تصویریں بنائیں۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور آہستہ آہستہ چلتا دیوار گریہ کے احاطہ سے باہر نکل آیا۔

عزیز احاطہ سے باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم وہاں سے نکل کر سیدھے ہوٹل پہنچے۔ راستے میں مجھے ایک فلسطینی گدھے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اُس کی تصویر بنائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ تصویر بنوا کر اُس نے گدھے کو ایڑھ لگائی اور گدھا تیزی سے دوڑے لگا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے عزیز سے کہا کہ وہ صبح ڈھائی بجے مجھے ہوٹل سے اُٹھالے اور بن گورین ائیر پورٹ چھوڑ آئے۔ ہوٹل سے ائیر پورٹ کا ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔ میری صبح ساڑھے چھ بجے فلائٹ تھی۔ مجھے آتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا کہ بن گورین ائیر پورٹ تھوڑا سا پیچیدہ اور بہت مصروف ائیر پورٹ ہے۔ اُس پر اسرائیل کی سکیورٹی کا گورکھ دھندہ۔ میری دائیں آنکھ بھی ابھی تک قوت دید سے محروم تھی۔ اِس لئے میں نے ائیر پورٹ پر جلدی پہنچنا زیادہ مناسب جانا۔

عزیز مجھ سے صبح ڈیڑھ بجے لوٹنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ لیٹ لنچ کرنے کی وجہ سے مجھے ڈنر کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کاؤنٹر کلرک کو صبح دو بجے ویک اَپ کال دینے کے لئے کہا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

یروشلم میں حضرت صالح علیہ السلام کا روضہ مبارک

روضہ ایک مسجد میں واقع ہے۔ لیکن اب مسجد کا صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے

حضرت صالح علیہ السلام کی قبر مبارک

ویسٹرن وال یا دیوار گریہ کا مقامِ دخول

دیوارِ گریہ کے احاطہ کا اندرونی منظر - پس منظر میں گنبد صخرا نظر آرہا ہے

امریکہ واپسی

جلدی سونے کی وجہ سے اگلی صبح میں ایک ڈیڑھ بجے اُٹھ گیا۔ اُٹھ کر غسل کیا۔ سفری لباس پہنا۔ سامان پیک کیا اور جانے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ جب کاؤنٹر کلرک کی ویک اَپ کال آئی تو میں پہلے ہی نہ صرف اُٹھ چکا تھا بلکہ روانگی کے لئے تیار تھا۔

نیچے جانے سے پہلے میں نے آخری بار کھڑکی کے پردے ہٹا کر مسجدِ اقصیٰ کے سرمئی اور ڈوم آف دی راک کے سنہری گنبد کی طرف دیکھا۔ کیمرے سے اُن کی چند تصویریں بنائیں۔ آخری بار یروشلم کے پہاڑوں کا نظارہ کیا اور دس پندرہ منٹ بعد اپنا بیگ کندھے پر لٹکائے ہوٹل کی لابی میں چلا آیا۔ میں نے دیکھا حاجی موسیٰ، ہوٹل کا مالک،

بھی مجھے الوداع کہنے کے لئے وہاں بیٹھا تھا۔ میں اُس کے اخلاص سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اتنی جلدی گھر سے وہاں آنے کی زحمت اُٹھانے کے لئے اُس سے معذرت کی۔ لیکن وہ ایک شفیق اور مہرباں دوست کی طرح میرے معذرت کرنے پر مجھے بار بار منع کرتا رہا۔

دراصل پچھلے پانچ چھ دن کی مسلسل گپ شب اور تبادلہ خیال سے ہمارے درمیان ایک خاموش رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ دوستی اور محبت کا رشتہ۔ وہ مجھ سے بہت متاثر تھا اور میں اُس سے۔ اُس نے عزیز کو تاکید کی کہ وہ مجھے ائرپورٹ پر اتارنے کی بجائے بورڈنگ پاس حاصل کرنے تک میرے ساتھ رہے۔

اُس کے بعد ہوٹل کی لابی سے میرے ساتھ مجھے چھوڑنے کے لئے گاڑی تک آیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اُس نے مجھے گلے لگایا اور خدا حافظ کہا۔ مجھے محسوس ہوا میں کسی عزیز دوست کو الوداع کہہ رہا ہوں۔

ہوٹل سے نکل کر یروشلم کے اندر چند سڑکوں پر سفر کے بعد گاڑی فری وے پر چڑھی تو فری وے بالکل خالی تھی۔ بس اِکا دُکا گاڑیاں فری وے پر آ جا رہی تھیں۔ فری وے خالی ہونے کا عزیز نے بھی فائدہ اُٹھایا اور گاڑی معمول سے زیادہ تیز چلائی۔

جب گاڑی سیکورٹی پوائنٹ پر پہنچی تو سکیورٹی والوں نے پہلے گاڑی روکی اور پھر عزیز سے کہا کہ وہ گاڑی سڑک سے ہٹا کر انسپکشن والی جگہ پر کھڑی کرے۔

عزیز نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر انسپکشن کے لئے کھڑی کی تو اسرائیلی فوجیوں نے عزیز کے کاغذات اور میرا پاسپورٹ لے لیا۔ اُس کے بعد انہوں نے گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میری فلائٹ کس وقت ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری فلائٹ صبح ساڑھے چھ بجے ہے۔ اُس کے بعد انہوں عزیز کے کاغذات اور میرا پاسپورٹ لوٹاتے ہوئے ہمیں آگے جانے کا اشارہ کیا۔

سکیورٹی پوائنٹ سے نکل کر پندرہ منٹ گاڑی چلانے کے بعد ہم بن گورین ائیر پورٹ پہنچے۔ عزیز نے حاجی موسیٰ کی ہدایات کے مطابق اندر جانا چاہا لیکن میں نے منع کر دیا۔ وہ کہنے لگا اگر میں آپ کے ساتھ اندر نہ گیا تو حاجی موسیٰ سخت ناراض ہوں گے۔ چنانچہ آپ مجھے اندر جانے سے نہ روکیں۔ لیکن یہ کام سکیورٹی والوں نے آسان کر دیا۔ سکیورٹی والوں نے بغیر ٹکٹ اُسے بورڈنگ پاس کے ایریا تک جانے سے بھی روک دیا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ امریکی ائیر پورٹس کے برعکس بن گورین انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر ائیر لائن کے کاؤنٹر تک جانے کے لئے بھی سکیورٹی سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے وہاں عزیز کو خدا حافظ کہا۔

سکیورٹی والوں نے وہاں میرا کمپیوٹر اور بیگ کی اسکیننگ کی۔ اسکیننگ کے بعد ایک دوسرے کاؤنٹر پر بیگ کھول کر دوبارہ سارے سامان کو مشین سے چیک کیا۔ اِس کے بعد سامان چیک کرنے والی لڑکی نے سامان دوبارہ بیگ میں پیک کرنے میں میری مدد کی۔ میں نے ائیر لائن کے کاونٹر کے بارے میں پوچھا تو سکیورٹی والی لڑکی نے کاؤنٹر تک میری راہنمائی کی۔ میری فلائٹ بن گورین ائیر پورٹ سے ویانا، ویانا سے میونخ اور میونخ سے سان فرانسسکو کے لئے تھی۔ کاونٹر کلرک نے مجھے سارے بورڈنگ پاس وہیں سے جاری کئے۔

ہر بورڈنگ پاس پر اس نے ایک دو تین مارک کر کے دائرہ لگایا کہ کونسا بورڈنگ پاس کس ائیر پورٹ پر استعمال ہو گا۔ میں بورڈنگ پاس پر لکھا گیٹ نمبر دیکھ کر اپنے مطلوبہ گیٹ کی طرف روانہ ہوا تو وہاں داخلے کے لئے ایک بار پھر سکیورٹی میں سے گزرنا پڑا۔

یہاں سکیورٹی کا عمل پہلی سکیورٹی سے بھی زیادہ سخت تھا۔ ہر چیز کی اسکیننگ کی گئی۔ ایک ایک چیز کا دوبارہ جائزہ لیا گیا۔ اس کے بعد مجھے گیٹ تک جانے والے راستے پر داخل ہونے دیا گیا۔

سکیورٹی سے نکل کر گیٹ کے راستے پر چلا تو یہ راستہ اُسی تیس فٹ اُونچی دیوار پر بنا تھا جس پر طرح طرح کے تصویری پیغامات نصب تھے۔

یہاں بھی واپس جانے والے مسافروں کے لئے بائیں دیوار پر اسرائیل کے لئے 90 سالہ ویژن کے بارے میں تصویری پیغامات نصب تھے۔ اِن تصویری پیغامات سے اسرائیلی ہر جانے والے کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ آئندہ 90 سال میں کس طرح فلسطین کی تعمیر نو کرنا چاہتے ہیں۔ ایک انتہائی دلچسپ تصویری پیغام میں ایک مغربی لباس میں ملبوس ہیٹ پہنے یہودی کو دکھایا گیا تھا جس نے ہاتھ میں بیلچہ پکڑ رکھا تھا۔ تصویر کے نیچے کیپشن لکھا تھا "ہیلپ ہم بلڈ فلسطین۔" گویا فلسطینی فلسطین تعمیر نہیں کر سکتے۔ فلسطین کی تعمیرِ نو کرنا بھی اب یہودیوں کا کام ہے کیونکہ اب یہ فلسطینیوں کا نہیں بلکہ اُن کا ملک ہے۔

میں گیٹ پر پہنچا تو فلائٹ میں ابھی کوئی گھنٹ بھر ہ باقی تھا۔ رات ڈنر نہ کرنے کی وجہ سے مجھے کچھ کھانے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ائیر لائن کی کاؤنٹر کلرک نے مجھے ائیر لائن کا کلب کارڈ دیا تھا۔ چنانچہ میں گیٹ پر بیٹھنے کی بجائے کچھ کھانے پینے کی غرض سے ائیر لائن کے کلب میں چلا گیا۔

کلب میں بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ کافی پی اور کلب کے کمپیوٹر پر بیٹھ کر اُس دن کے پاکستان اور یو ایس اے کے اخبارات دیکھے۔ اپنی ای میلز چیک کیں۔ پھر بورڈنگ کا وقت شروع ہونے سے دس منٹ پہلے میں کلب سے اُٹھ کر گیٹ

پر چلا گیا۔ میرے گیٹ پر پہنچتے ہی جہاز پر بورڈنگ کا عمل شروع ہو گیا۔ تل ابیب سے ویانا کی ساڑھے تین گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ اِس لئے میں نے جہاز میں بیٹھ کر ائیر ہوسٹس کو ناشتے کے بارے میں منع کیا ،اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھی اور اگلے تین گھنٹے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد بن گورین ائیر پورٹ کے رن وے پر پرواز کے لئے جہاز نے دوڑنا شروع کیا تو چند لمحوں کے لئے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک نظر تل ابیب کی روشنیوں کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو گیا۔ میرا اسرائیل کا مختصر سفر مکمل ہو چکا تھا۔

تل ابیب سے ویانا، ویانا سے میونخ اور میونخ سے سان فرانسسکو پہنچا تو جہاز سے نکل کر امیگریشن کاونٹر پر پہنچنے والا میں پہلا مسافر تھا۔ میں گھر لوٹنے پر خوش تھا۔

امگریشن آفیسر نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہوئے پوچھا: "کہاں سے آرہے ہو۔" میں نے کہا: "اسرائیل سے۔" امگریشن آفیسر نے پوچھا: "کیسا رہا۔" میں نے کہا: "بہت ریوراڈنگ۔۔۔" اُس نے میرا پاسپورٹ اسٹیمپ کر کے میرے حوالے کیا اور کہا: ویلکم ہوم۔۔" میں نے اپنا پاسپورٹ اُس سے لے کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور امیگریشن کاؤنٹر سے آگے بڑھ گیا۔

میرا خیال ہے کہ میں چند ماہ بعد دوبارہ اسرائیل جاؤں گا۔ ابھی وہاں دیکھنے کو اور بہت کچھ ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ زیادہ دنوں کے لئے جاؤں تا کہ جو چیزیں نہیں دیکھ سکا وہ دیکھوں اور جو چیزیں دیکھنے کے لئے زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت تھی وہاں اب زیادہ وقت صرف کروں۔

ختم شد

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہِ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطورِ لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشائیے لکھے۔

جنرل ضیا الحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فینکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیرِ نظر سفرنامے "اسرائیل میں چند روز" کے علاوہ وہ تین ناولوں 'مٹی کا بیٹا'، 'نسل سوختہ' اور 'شب گزیدہ سحر' اور کہانیوں کے دو مجموعوں "آئینہ کہانی" اور "مکلالے کا قتل" اور نثری نظموں کی ایک کتاب "برف میں کھلا پھول" کے مصنف ہیں۔ تاحال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

مصنف کی دیگر کتابیں

مٹی کا بیٹا۔۔۔ناول

ایک اچھوتی اور دلچسپ کہانی جو پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو کر امریکہ سے ہوتی ہوئی اسی گاؤں میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ساری عمر اپنے طبعی والد کی تلاش میں کئی دلچسپ مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسانی جذبوں کی عظیم داستان جو انسان دوستی اور انسانی مساوات کا درس دیتی ہے۔ تشدد اور جنگ سے بچنے کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کے احترام کی تلقین کرتی ہے۔

نسلِ سوختہ۔۔ناول

1947 میں پاکستان بننے سے لیکر 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان ٹوٹنے کی کہانی۔ پاکستانی سیاست کی بائیبل جس میں اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان دولخت ہُوا۔ پاکستان کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے ممکنہ حل پیش کرتی ہے۔ پاکستانی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے اس ناول کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس کا مطالعہ اُنہیں پاکستان کو ایک نئے پس منظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شب گزیدہ سحر۔۔ناول

شب گزیدہ سحر روسی انقلاب کے بعد سوویت یونین کی تشکیل سے لے کر تحلیل تک کی کہانی ہے جو ایک رومانی داستان کے ذریعے نہ صرف انقلاب کی کہانی سناتی ہے بلکہ سوویت یونین کے عروج و زوال اور آخرِکار تحلیل کے پس پردہ عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے قارئین کو سوویت

یونین کے بارے میں ایک نیا پسِ منظر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی کارکن اس ناول کو پڑھ کر انقلاب کے لئے اپنی جدوجہد میں ممکنہ غلطیوں سے خود کو اور تحریک کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

آئینہ کہانی۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

آئینہ کہانی میں مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس انوکھی اور دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی انوکھے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے جسے پڑھ کر انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مکالمے کا قتل۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

مکالمے کا قتل مصنف کے قلم سے لکھی گئی پچیس مزید کہانیوں کا مجموعہ جن میں مصنف نے انوکھے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اِن کہانیوں میں مصنف کا دیگر لکھاریوں سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے کا عمل اُسے ایک طرف اپنے ہم عصر لکھاریوں سے ممتاز کرتا ہے اور دوسری طرف قارین کو ان موضوعات کو مکمل طور پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔

برف میں کھلا پھول۔۔۔ نثری نظمیں

برف میں کھلا مصنف کا ۵۷ نثری نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ نثری نظم میں بھی ایسے شاعرانہ امیجز تراشے جاسکتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان وہی حظ اٹھاتا ہے جو کبھی روائیتی شاعری کا طرہ امتیاز تھا۔

کتاب خریدنے کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں:

Email: kashraf@ix.netcom.com